Phone: 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

# طلوعِ اسلام

دسمبر 1960ء

THE PRESIDENT OF PAKISTAN declared—

It was important to recognise the fact that while principles were immutable, methods must change with times and that the change must be healthy. We are making earnest efforts to find a Constitution which was in line with our faith and which provided full opportunities to the people to participate in the task of implementing the ideology of Pakistan in every walk of life. We cannot ignore the fact that our country is the product of the ideology of Islam. This is the foremost justification for our existence and we cannot be true to Pakistan without being true to this ideology.

*( Speeches in Jeddah and Cairo )*

صدرِ مملکت پاکستان کا اعلان—

اس حقیقت کا تسلیم کرنا نہایت ضروری ہے کہ دین کے اصول تو غیر متبدل ہیں لیکن ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طریقوں کو زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہنا چاہئے، اور اس تبدیلی کو صحت مندانہ ہونا چاہئے۔ ہم پوری سنجیدگی سے اس امر کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہم ایک ایسا آئین مرتب کریں جو ہمارے ایمان سے ہم آہنگ ہو اور جو لوگوں کو پورے مواقع بہم پہنچائے کہ وہ پاکستان کی آئیڈیالوجی کو زندگی کی ہر روش میں عملاً نفاذ پذیر کرنے کے پروگرام میں حصہ لے سکیں۔ ہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ہمارا ملک، اسلامی آئیڈیالوجی کی تخلیق ہے ۔ یہی ہماری ہستی کی سب سے بڑی وجہ جواز ہے اور جب تک ہم اس آئیڈیالوجی کو بصدقِ دل قبول نہ کریں، ہم کبھی سچے پاکستانی نہیں ہو سکتے۔

(جدہ اور قاہرہ کی تقاریر)

شائع کردہ:

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت پرچہ ۸ آنے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر!

ماہنامہ

# طلوعِ اسلام

لاہور


**بدلِ اشتراک**
ہند و پاکستان سے سالانہ :- آٹھ روپے
غیر ممالک سے :- سولہ شلنگ

**قیمت فی پرچہ**
ہند و پاکستان سے
بارہ آنے

**ٹیلی فون :-** ۷۵۰۰
خط و کتابت کا پتہ
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام، ۲۵ بی گلبرگ۔ لاہور

جلد ۱۳ | دسمبر سنہ ۱۹۶۰ء | نمبر ۱۲


## فہرست مضامین


| | | |
|---|---|---|
| لمعات | | ۲ |
| باب المراسلات | | ۱۱ |
| والعصر | (محترم پرویز صاحب) | ۱۷ |
| قائد اعظم | (محترم صفدر سلیمی صاحب) | ۳۳ |
| نابینائی | (علامہ اسلم جیراجپوری) | ۵۷ |
| حقائق و عبر | | ۷۱ |
| ایک اہم سوال | | ۷۹ |

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# لمعات

سابقہ ماہ (نومبر ۱۹۶۰ء) میں ہمارے سامنے ایک ایسا واقعہ آیا ہے جو نہ صرف پاکستان کی تاریخ بلکہ خود اسلام کی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے ——— ایسی نمایاں کہ قرطاسِ زمانہ پر سے اس کے نقوش بمشکل مٹ سکیں گے

یہ واقعہ ہے صدرِ مملکت پاکستان کا، مسلم ممالک (عرب اور مصر) میں دورہ۔

قارئین طلوع اسلام اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ طلوع اسلام شخصیتوں کو کبھی اہمیت نہیں دیتا۔ وہ اہمیت دیتا ہے اصول اور نظام کو، اور شخصیتوں سے صرف اس حد تک تعلق رکھتا ہے جہاں تک ان کا اُن اصولوں سے تعلق ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے نزدیک، اس دورہ کی اہمیت کی وجہ یہ نہیں کہ ایک مملکت کے سربراہ نے دوسرے ممالک کے اکابرین اور زعماء سے ملاقات کی۔ مملکتوں کے سربراہوں کا دوسرے ممالک میں آنا جانا کون سا ایسا اہم واقعہ ہے جسے اس قدر نمایاں حیثیت کا حامل سمجھا جائے کہ قرطاسِ زمانہ اس کے نقوش کو بمشکل مٹا سکے۔ اس قسم کا آنا جانا آئے دن ہوتا رہتا ہے اور اس کی یاد، کا جریدۂ عالم پر منقوش ہونا تو کجا، وہ لوگوں کے دلوں میں بھی چند دن سے زیادہ باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا صدرِ مملکت پاکستان کا حالیہ دورہ اس اعتبار سے چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ اہمیت رکھتا ہے اسلامی نقطۂ نگاہ سے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے اسے اس قدر اہم اور نمایاں حیثیت کا حامل قرار دیا ہے۔ دیگر مسلم ممالک کے سربراہ ہمارے ہاں اکثر آتے رہے ہیں (اور ہمارے ہاں کے ارباب حل و عقد بھی دیگر ممالک میں جاتے رہے ہیں) لیکن وہ جو کچھ ان مواقع پر کہتے وہ یا تو "اس جگہ خیریت ہے اور آپ کی خیریت خداوند تعالیٰ سے نیک مطلوب چاہتا ہوں" کے انداز کا ہوتا، اور یا، اگر انہیں کہیں مجبوراً اسلام کا نام لینا پڑتا، تو یہ لفظ ان کی زبان پر کچھ اس طرح شرمائے، لجائے اور جھینپے ہوئے آتا گویا ان سے کوئی ایسی خطا سرزد ہو رہی ہے جس پر ان کا ضمیر انہیں سخت ملامت کر رہا ہے اور وہ اس کی سخت احتیاط برت رہے ہیں کہ کسی کو کانوں کان خبر

نہ ہونے پائے کہ ان سے اس حرکت ارتکاب ہوا ہے۔ اس کے برعکس، آپ صدر مملکت پاکستان کے حالیہ دورہ کی روئداد پر نگاہ ڈالیے۔ یوں نظر آئے گا گویا وہ اسلام کے پیغامبر کی حیثیت سے ان ممالک کا دورہ کر رہے ہیں ——— اور اسلام بھی وہ نہیں جسے صدیوں کے جمود و تعطل نے ممی شدہ لاش بنا کر رکھ دیا ہے۔ بلکہ وہ اسلام جو زندگی؛ حرکت، حرارت، توانائی اور ارتقاء کا دلآویز اور حیات بخش پیکر ہے۔ انہوں نے اسلام کے اس زندہ و تابندہ پیغام کو ہر مقام اور ہر تقریب میں پیش کیا اور اس جرأت اور بے باکی، اس وضاحت اور صفائی، اس نکھار اور ابھار کے ساتھ پیش کیا جس کی مثال اس دور میں کم ملتی ہے۔ وہ شاہ سعود کا محل تھا یا حریم کعبہ۔ مصر کا ایوان حکومت تھا یا صدر ناصر کا دعوت کدہ۔ ملٹری اکادمی تھی یا قاہرہ کا دارالعلوم۔ ہر مقام اور ہر تقریب پر ان کا ایک ہی پیغام تھا۔ اور وہ تھا اسلام کا پیغام۔

کہئے اگر جب، اس زمانے میں، ایک عظیم مملکت کا سربراہ، اسلام کا ایسا سفیر اور نقیب بن کر دیگر ممالک کی سیاحت کرے، تو یہ واقعہ اس قابل ہے یا نہیں کہ اسلام کی تاریخ میں اسے نمایاں حیثیت حاصل ہو؟

۹؍ نومبر کو صدر ایوب نے، سعودی عرب کے دارالحکومت، ریاض؛ میں عبدالعزیز ملٹری اکادمی کا معائنہ کیا اور وہاں کے افسروں اور سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:-

> یہ اسلام کا پیغام تھا جس نے ماضی میں مسلمانوں کو اس قدر عظمت اور شوکت عطا کی تھی۔ اگر ہم پھر اسی عظمت کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے ——— اور وہ طریقہ ہے اسلام سے متمسک ہو جانے کا۔ اگر ہم نے ایسا کیا، تو مجھے اس میں قطعاً شبہ نہیں کہ دنیا کی امامت پھر ہمارے حصے میں آ جائیگی (ڈان ۱۰؍ ۱۱)

معلوم نہیں، سرزمین حجاز نے کتنی صدیوں کے بعد کسی مملکت کے سربراہ کی زبان سے یہ الفاظ سنے ہوں گے ——— !

حجاز سے واپسی پر، شاہ سعود اور صدر ایوب کی طرف سے جو مشترکہ کمیونک شائع ہوا؛ اس میں اس امر کا تذکرہ خاص طور پر کیا گیا تھا کہ

> شاہ سعود اور صدر پاکستان نے، اسلامی روح کے افہام و تفہیم اور مسلم ممالک میں اسلامی اقدار اور ثقافت کے تحفظ سے متعلق مسائل پر تفصیلی گفتگو کی۔

انھوں نے اس بات پر بھی اتفاق کیا کہ

> اگر مسلم ممالک باہمی امن، تعاون اور افہام و تفہیم سے کام لیں تو وہ اپنی توانائیوں کو اپنے اپنے ملک کے باشندوں کی مرفہ الحالی اور اسلامی تصورات کے تحفظ اور ارتقاء کے لئے صرف کرنے کے قابل ہو جائیں گے (ڈان)

نیز

> انھوں نے حج کی اہمیت کے اس گوشے پر بھی گفتگو کی کہ یہ تقریب، فریضۂ اسلام میں تبادلۂ خیالات اور باہمی

خیر سگالی اور ایک دوسرے کی بہبودی (کی بھی ضامن ہو سکتی ہے)۔ انہوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ دور حاضر کے تقاضوں کے پیش نظر، عالم اسلام کو حج کی اس اہمیت کی طرف پیش از پیش توجہ دینی چاہئے۔ (ایضاً)

۲ نومبر کو صدر ایوب نے جدہ میں جو تقریر کی اس میں دو ایک ایسے مسائل کو سامنے لایا گیا جو (ہمارے نزدیک) اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے اساس و بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسلام کی بنیاد توحید پہ ہے اور توحید کا عملی مفہوم یہ ہے کہ

(۱) اطاعت صرف قوانین خداوندی کی ہو۔ اور کسی کو اس کا اختیار نہ ہو کہ ان قوانین خداوندی میں کسی قسم کا رد و بدل کر سکے۔ اور

(۲) انسانی وحدت کی بنیاد، زبان، رنگ، نسل، وطن کے اشتراک کے بجائے، دین کا اشتراک قرار دیا جائے۔

صدر ایوب نے اپنی تقریر میں ان ہر دو بنیادی نکات کی اہمیت پہ زور دیا۔ ثانی الذکر نکتہ کے متعلق انہوں نے کہا۔

آج ساری دنیا، سیاسی اور مادی آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر اپنے اپنے گروہوں کی تشکیل کر رہی ہے۔ ان تصورات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ تصورات، انسان کی انتہائی منزل کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتے۔ اس دنیا میں اور اُخروی زندگی میں (نوع انسان کی) نجات صرف اس آئیڈیالوجی کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے جو انسان کے مادی اور روحانی تقاضوں میں صحیح صحیح توازن قائم کر سکے۔ ہم مسلمانوں کی خوش بختی ہے کہ ہمارے پاس وہ آئیڈیالوجی، دین اسلام کی شکل میں موجود ہے ——

...... مسلم ممالک کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ اپنے اپنے گھروں کی درستی کے بعد اسلام کی عالمگیر برادری کی تشکیل کریں اور اس میں باہمی رقابتوں کو دخیل نہ ہونے دیں۔ (ڈان - ۵ نومبر سنہ ۶۴ء)

چونکہ مصر آج کل "عربی قومیت" کے نشے میں زیادہ سرشار ہے، اس لئے انہوں نے وہاں پہنچ کر، دین کے اشتراک کی بنیادوں پہ وحدتِ ملت کے سوال پہ اور بھی زیادہ زور دیا۔ وہاں تو شاید ہی کوئی تقریب ایسی ہو جس میں اس کا ذکر نہ آیا ہو۔ ۸ نومبر کو جب قاہرہ میں مملکت کی طرف سے سب سے پہلی دعوت دی گئی تو اس میں صدر ایوب نے کہا

جب تک ہم اسلام کے بنیادی اصولوں سے متمسک رہیں گے، مادی، سیاسی یا مملکتی حدود کا کوئی خیال ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے جدا نہیں کر سکے گا۔ خدا سے میری دعا ہے کہ وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو وحدتِ مقصد اور یقین کی اس دولت سے مالا مال کر دے جس کا اسلام نے حکم دیا ہے اور جو آج کی دنیا میں، جس میں آئیڈیالوجی کی کشمکش ہو رہی ہے، ان کے نصب العین حیات کا تقاضا ہے۔ (ڈان ۸/۱۱)

اسی تقریر میں آگے چل کر انہوں نے کہا کہ :-

ہم نے اسرائیلی حکومت کے معاملہ میں جو فیصلہ کیا ہے (کہ ہم عربوں کی حمایت کریں گے) تو میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس سے ہم کسی پر کوئی احسان نہیں کر رہے۔ ہمارے لئے یہ قومی یا بین الاقوامی مسئلہ نہیں۔ یہ ہمارے ایمان کا تقاضا ہے۔ پاکستان نے ہمیشہ عربوں کا ساتھ دیا ہے، اور انشاء اللہ ہم آئندہ بھی ایسا ہی کریں گے[1]۔ اس کے لئے ہم ان سے کوئی معاوضہ یا حق الخدمت نہیں چاہتے۔ ہم صرف ان کی خیر سگالی کے متمنی ہیں۔

جو لوگ ایمان کے رشتے سے باہم گرہ پیوست ہوں، وہ ان تمام قوتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں جو ان میں نزاع اور تشتت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اور جب یہ ایمان، اسلام کا عطا کردہ ایمان ہو، تو ان میں باہمی افتراق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لئے کہ اسلام، اختلافات کے مقابلہ میں اخوت، اشتعال انگیزی کے مقابلہ میں نرم روی اور سہار، غلط فہمیوں کے مقابلہ میں باہمی افہام و تفہیم اور غصے کے مقابلہ میں عفو اور درگذری کی روح ہے۔ (ڈان۔ ۸ نومبر ۶۰ء)

پھر انہوں نے ۹ نومبر کو قاہرہ یونیورسٹی کی اس تقریب میں، جو اپنی اہمیت کے اعتبار سے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، اسی نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

مسلمان کہیں بھی ہو، وہ اپنے اللہ سے اور خود اپنی ذات سے ایک عہد وفا استوار کرتا ہے۔ یہ عہد وفا، دنیا کی ہر دوسری وفاشعاری کے عہد سے بلند ہے۔ یہ عہد وفا ہے ایمان کا۔ یہی وہ عہد وفا ہے جس کی وجہ سے، دنیا کے تمام مسلمان، حکومتوں کے سیاسی اختلافات اور خارجی نزاعات کے علی رغم، رشتۂ اخوت و مودت میں منسلک نظر آتے ہیں اور خیر سگالی اور خیر اندیشی کی غیر مرئی گرہیں انہیں ایک دوسرے سے پیوست رکھتی ہیں۔ میری دعا ہے کہ باہمی مودت اور محبت کا یہ وسیع و عمیق چشمہ، دن بدن وسیع سے وسیع تر اور عمیق سے عمیق تر ہوتا جائے اور خدا انہیں اس سے محفوظ رکھے کہ وہ اسے ہنگامی فائدوں یا عارضی مصلحتوں کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیں۔

باہمی محبت اور اخوت کا نتیجہ یہ ہے کہ الجیریا کے مسلمانوں پر مظالم ہوں یا فلسطینی پناہ گزینوں پر، کشمیری مسلمانوں کے جانکاہ مصائب ہوں یا اسرائیلی حکومت کی آئے دن کی دھمکیاں (یہ مقامی اثرات نہیں رکھتیں بلکہ) تمام دنیا کے مسلمانوں کے دل میں یکساں جذبات ہمدردی کو بیدار کر دیتی ہیں۔ (ڈان۔ ۹ و ۱۰ نومبر ۶۰ء)

---

[1] دوسرے مقام پر صدر ایوب نے اس کی وضاحت کر دی تھی کہ ہمارے نزدیک اس معاملہ میں عرب حق پر ہیں۔

آپ سوچئے کہ اس زمانے میں، جب کہ ساری دنیا وطنی قومیتوں کے دائروں میں گھری ہوئی ہے اور سیاسی امور میں مذہب کا نام تک سننا نہیں چاہتی، یہ آواز کہ ملت کی وحدت کا مدار، ایمان کے اشتراک پر ہے، کتنی جرأت چاہتی ہے —— اور پھر آواز بھی ان لوگوں کے گھر جا کر بلند کرنا جو اپنی نسل پرستی پر فخر کرتے نہ تھکتے ہوں! —— ظاہر ہے کہ یہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کے دل کی گہرائیوں سے یہ آواز نکلے اور اس کا یقین محکم اسے اس کے اعلان پر آمادہ کرے۔

پھر فطرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ایک ہندی مسلمان، عربوں سے جا کر کہہ رہا ہے کہ اسلام، نسل پرستی کی جگہ اخوت دینی سکھانے کے لئے آیا تھا —— سچ ہے، اسلام نہ عربوں کا ہے نہ عجمیوں کا۔ یہ اسی کا ہے جو اسے سمجھ کر اپنا لے۔

---

اب ہم اس دوسرے نکتہ کی طرف آتے ہیں جس کے متعلق ہم نے کہا ہے کہ وہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے اساس اور بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا میں عام طور پر دو قسم کی حکومتوں کا تصور پایا جاتا ہے۔ ایک حکومت سیکولر انداز کی ہے جس کا سکہ پورے مغرب میں رواں ہے (خواہ وہ برطانیہ اور امریکہ کی جمہوریت ہو یا روس کی آمریت)۔ اس حکومت کی بنیاد اس تصور پر قائم ہے کہ مملکت کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جس قسم کا قانون چاہے مرتب کرلے اور جس قانون کو چاہے منسوخ کر دے۔ اس کے اس اختیار و اقتدار پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی۔ دوسرا انداز مذہبی حکومت کا ہے جس میں مقننہ کو کوئی اختیار نہیں ہوتا اور حکومت کو وہ قوانین نافذ کرنے پڑتے ہیں جنہیں ارباب مذہب، شریعت کے نام سے پیش کر دیں۔ ان ہر دو تصورات کے خلاف، قرآن کا تصور یہ ہے کہ دین کے اصول (جو خدا کی طرف سے وحی کے ذریعے عطا ہوئے ہیں اور جو قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں) غیر متبدل رہتے ہیں اور مملکت ان حدود کے اندر رہتی ہوئی، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قوانین مرتب کر سکتی ہے۔ حکومت کا یہ وہ تصور ہے جسے صدر پاکستان نے حجاز اور مصر ہر دو مقامات پر نہایت وضاحت سے پیش کیا —— وہ حجاز جس میں مذہبی حکومت کا تصور رائج ہے اور وہ مصر جس میں عملاً سیکولر انداز کی حکومت قائم ہے۔ صدر محترم نے اپنی جدہ کی تقریر میں کہا۔

> ہر انسان کے لئے ضروری ہے کہ اس کے سامنے کوئی اخلاقی اور روحانی آئیڈیالوجی ہو جس سے وہ اپنے مادی اور بلند اقدار کے تقاضوں میں توازن قائم کر سکے۔ ہمارے لئے یہ آئیڈیالوجی لازماً اسلام کی ہے۔ یہ امر موجب تاسف ہے کہ لوگ بالعموم اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ مذہب انسان (کے فائدے) کے لئے دیا گیا تھا، انسان کو مذہب (کے کسی فائدے) کے لئے نہیں بنایا گیا تھا۔ اس حقیقت کو فراموش کر دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ مذہب کی قوتوں کو انسان کی خدمت کے لئے استعمال کیا جائے، اسے زندگی کے حقائق سے یکسر الگ کر دیا گیا ہے۔

اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ دین کے اصول غیر متبدل ہوتے ہیں لیکن ان اصولوں پر

عمل پیرا ہونے کے طریقے زمانے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں لیکن (یہ بھی ضروری ہے کہ) یہ تبدیلی صحت مندانہ ہو۔

پاکستان اس بنیادی مسئلہ کے حل کے لئے امکان بھر کوشش کر رہا ہے اس ضمن میں سب سے پہلے ہماری کوشش یہ ہے کہ ہم ایسا آئین مرتب کریں جو ہمارے ایمان (FAITH) سے ہم آہنگ ہو اور جو لوگوں کو اس قابل بنا دے کہ وہ پاکستان کی آئیڈیالوجی کو زندگی کے ہر شعبہ میں عملاً نفاذ پذیر کر سکیں۔ ہماری دوسری کوشش یہ ہے کہ ہم اپنے نظام تعلیم میں ایسی تبدیلی پیدا کریں جس میں شروع ہی سے دینی اور دنیاوی تعلیم کا سلسلہ دوش بدوش چلے۔ (ڈان، ۵ نومبر ۱۹۶۰ء)

اسی تقریر میں انہوں نے آگے چل کر کہا:-

اس ضمن میں سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم اپنے ذہن کو ماضی کے جمود اور تعطل سے آزاد کریں۔ دین کے ہر معاملہ میں دیانتدارانہ اور آزادانہ طور پر پوری پوری تحقیق کریں، اسلام پر اس انداز سے عمل کریں کہ وہ اس ایٹمی دور میں زمانے کی برق رفتاری کا ساتھ دے سکے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے ہم اپنے نظام تعلیم میں ایسی انقلابی تبدیلی کرنا چاہتے ہیں جس سے ہماری آنے والی نسلیں دینی اور دنیاوی تعلیم کے امتزاج سے نہایت اچھے انسان اور نہایت اچھے مسلمان بن سکیں۔

پھر انہوں نے، ۹ نومبر کو، قاہرہ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے کہا:-

جوں جوں ہم دین کی روح سے دور ہٹتے گئے اور محض رسم پرستی کو دین سمجھ لیا، دین کی اصل و حقیقت کی جگہ سطحیت نے لے لی۔ غور و فکر کی جگہ توہم پرستی آ گئی۔ اور جرأت تحقیق کی جگہ روایت پرستی کی اندھی تقلید نے سنبھال لی۔ مسلمانوں کو تاج و تخت اور حکومتوں اور سلطنتوں کے چھن جانے سے اس قدر نقصان نہیں ہوا جس قدر نقصان اس سے ہوا کہ ان سے اس دل کی حکومت چھن گئی جس کا شعار آزادانہ تحقیق و کاوش تھا اور اس کی جگہ ان پر عقلی جمود مسلط ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی تو آگے بڑھتی گئی لیکن اسلام کا علم و عمل اس سے صدیوں پیچھے رہ گئے۔ اور وہ دین، جس کا مقصود یہ تھا کہ وہ ایک مکمل، متحرک اور حرکت بخش ضابطہ حیات بنے، محض پوجا پاٹ کی ظواہر پرستی کا پیکر بن کر رہ گیا۔ نتیجہ یہ کہ اس دنیا میں جو ہر آن آگے بڑھتی جا رہی ہے، مسلمان کی نگاہیں مڑ مڑ کر پیچھے کی طرف جاتی ہیں۔

ہمارے نظام تعلیم کا اولین مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ہم اسلام کو توہم پرستی اور تقلید و جمود کے اس جالے سے نکالیں جو اس پر چاروں طرف سے تنا گیا ہے، اور عصر حاضر کے علم اور سائنٹیفک تحقیقات کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر اسے آگے بڑھاتے جائیں۔ (ڈان، ۱۰ نومبر ۱۹۶۰ء)

۷ نومبر کو صدرِ پاکستان کے اعزاز میں، (NATIONAL UNION RALLY) کا اجتماع ہوا۔ اس میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

ایک اور مسئلہ بھی ایسا ہے جو میرے خیال میں آپ حضرات کے ذہن رسا کے بھی ایسا ہی قریب ہے جیسا ہم پاکستانیوں کے۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اسلام ایک ترقی پسند اور متحرک دین ہے۔ یہ ایک ایسا دین ہے جو عقل و فکر اور غور و تدبر کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ جو ہمیں زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ چلنا سکھاتا ہے۔ لیکن آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اس دین کے ساتھ بیتی کیا ہے؟ ایک طرف اس دین کو دیکھئے اور دوسری طرف عالمِ اسلام پر نگاہ ڈالئے، بات نکھر کر سامنے آجائے گی۔ آج ساری دنیا کے مسلمان سب سے زیادہ پیچھے اور سب سے کم تعلیم یافتہ ہیں۔ کیا یہ صورتِ حالات ایسی تشویش انگیز نہیں کہ ہم سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس پر غور کریں کہ اس قسم کے دین کے نام لیواؤں کی ایسی حالت کیوں ہوگئی؟ ہم سے کہاں غلطی ہوئی ہے اور اس کے ازالہ کی کیا صورت ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ ہر اس مسلمان کا فریضہ ہے جسے دیدۂ بینا عطا ہوا ہے کہ وہ سوچے کہ ہمارے اس زوال کے اسباب کیا ہیں؟ اور جس نتیجہ پر وہ پہنچے، اسے بلا خوف اور بے دھڑک واضح الفاظ میں قوم کے سامنے پیش کر دے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ ہمارے مذہبی طبقہ اور مذہبی راہ نماؤں نے مشکلات و مصائب کے ہجوم میں ہماری ملی روایات کے حفظ و بقاء کے لئے بڑی خدمات سرانجام دی ہیں۔ لیکن کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ وہ اس وقت کر رہے ہیں، وہ اس طریق کی طرف ہماری راہ نمائی کر سکتا ہے جس سے ہم زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کے قابل ہو سکیں؟ ممکن ہے آپ اس کے جواب میں کہہ دیں کہ (۱) اس کے لئے یہ بتانا کیا ضروری ہے اور (۲) ہم پر یہ بھی کب لازم ہے کہ ہم زمانے کے تقاضوں کے ساتھ چلیں۔ میرا جواب یہ ہے کہ قوانینِ فطرت اور خود قرآن کریم ہمیں واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ جو قوم اپنے اندر تبدیلی نہیں پیدا کرتے اور زمانے کے ساتھ نہیں چلتے، وہ بالآخر تباہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا، اگر ہم زمانے کے ساتھ چلنے کے لئے تیار نہیں ہونگے (اپنی کمزوریوں کا اعتراف اور انہیں دور کرنے کی کوشش نہیں کریں گے)، تو ہم پھر دوسروں کے غلام بن جائیں گے اور اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اس مرتبہ کی غلامی، سابقہ دور کی غلامی کے مقابلہ میں، بہت زیادہ دیرپا ہوگی۔ (زمان ۱۰ نومبر ۱۹۶۰ء)

دین کی غرض و غایت اور اسلام کی آئیڈیالوجی کو اس طرح واشگاف کرنے کے بعد انہوں نے پاکستان کا ذکر کیا اور فرمایا کہ

پاکستانی اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ان کا ملک اسلامی آئیڈیالوجی کی تخلیق ہے۔ اصل

> تو یہ ہے کہ ہماری ہستی کی سب سے مقدم وجۂ جواز ہی یہی ہے، اور اگر ہم اس آئیڈیالوجی کو بصدقِ دل قبول نہیں کرتے تو ہم کبھی سچے پاکستانی نہیں بن سکتے۔ یہ وجہ ہے کہ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ حتی الامکان عصرِ حاضر کی سائنٹیفک تحقیقات کے ضمن میں، اسلام کا صحیح صحیح مطالعہ کریں۔ (ڈان۔ ۱۰ر نومبر ۱۹۶۰ء)

پاکستان میں اسلامی آئیڈیالوجی کی یہی وہ اہمیت تھی جس کے پیشِ نظر انھوں نے (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) قاہرہ میں اعلان کیا تھا کہ

> ہم انتہائی کوشش کر رہے ہیں کہ پاکستان کے لئے ایسا آئین مرتب کریں جو ہمارے ایمان سے ہم آہنگ ہو۔ اور جو وہاں کے رہنے والوں کو اس قابل بنا دے کہ وہ پاکستان کی آئیڈیالوجی کو زندگی کے ہر شعبے میں نفاذ پذیر کر سکیں۔ (ڈان، ۵ر نومبر ۱۹۶۰ء)

یہ تھے اسلام کے متعلق وہ خیالات جن کا اظہار صدرِ مملکتِ پاکستان نے، سرزمینِ حجاز اور مصر میں، اس وضاحت و صراحت اور اس جرأت اور بے باکی سے کیا۔ آپ ان خیالات کو بنظرِ تعمق دیکھئے اور پھر سوچئے کہ اس قسم کی باتیں مسلم ممالک کے کسی اور سربراہ سے بھی سننے میں آئی ہیں؟ یہ مقام کس قدر باعثِ فخر و مسرت ہے کہ صحیح اسلام کو اس انداز سے پیش کرنے کی سعادت مملکتِ پاکستان کے سربراہ کے حصے میں آئی۔ صدرِ مملکت کا یہ اعلان کہ ہم پاکستان میں ایسا آئین مرتب کرنا چاہتے جو ہمارے ایمان (FAITH) سے ہم آہنگ ہو، اور ہمارا ایمان یہ ہے کہ دین کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہتے ہیں اور اس پر عمل پیرا ہونے کے طریقے بدلتے رہتے ہیں، پاکستان کے لئے کس قدر درخشندہ و تابناک مستقبل کی نوید جانفزا ہے۔ یہ پیامِ صبحِ روشن، ہمارے اس یقین کے لئے مزید تقویت کا موجب بنتا ہے کہ

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

حق و صداقت کے اس نعرۂ مستانہ کا اثر، خود مصر میں کیا ہوا، اس کا اندازہ اس رپورٹ سے لگایئے جو موقر جریدہ ڈان کے رپورٹر نے قاہرہ سے بھیجی تھی۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ

> یہ حقیقت کہ صدرِ پاکستان کی یہ آواز صدا بصحرا ثابت نہیں ہوئی، اس واقعہ سے واضح ہو جائے گی کہ صدر ناصر نے، جو عام طور پر اسلام کا ذکر تک نہیں کیا کرتے، ایک استقبالیہ میں تقریر کرتے ہوئے اس امر پر خاص طور پر زور دیا کہ متحدہ عرب جمہوریہ کے مسلمان بھی پاکستانیوں کی طرح مسلمان ہیں اور ہمیشہ سچے مسلمان رہیں گے۔ (ڈان۔ ۱۰ر نومبر ۱۹۶۰ء)

فالحمد للہ علی ذالک ——— اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں ———

اس آواز کے اثرات کا ایک اور پہلو ہے جو اس سے بھی زیادہ حقیقت کشا اور امید افزا ہے۔ صدر پاکستان نے بار بار اس حقیقت کو دُہرایا کہ اسلامی نظام میں صرف اصول غیر متبدل رہتے ہیں اور ان پر عمل پیرا ہونے کے طرق و اسالیب زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ انہوں نے یہ کچھ عرب میں بھی کہا اور مصر میں بھی، لیکن کسی ایک گوشے سے خفیف سی آواز بھی اس کے خلاف نہ اُٹھی، نہ صرف یہ کہ اس کے خلاف ایک حرف تک بھی کہیں سے سُنائی نہ دیا، بلکہ اس پر تحسین و ستائش کے پھول برسائے گئے۔

مملکت حجاز کے مفتی اعظم، جن کی بلندیٔ مرتبت کا یہ عالم ہے کہ وہ اس سے پہلے کسی بڑی سے بڑی شخصیت کو بھی ملنے کے لئے اپنے مکان سے باہر نہیں نکلے تھے، صدر پاکستان کی ملاقات کے لئے خود چل کر گئے اور انہیں اپنی دعاؤں سے نوازا۔ جامعہ قاہرہ کے ریکٹر (سید مصطفےٰ السعید) نے صدر ایوب کو مخاطب کر کے کہا کہ

آپ کا ملک، دنیائے اسلام کا عظیم ترین مرکز بن گیا ہے جہاں سے اسلام کی روشنی اکناف و اطراف عالم تک پھیل رہی ہے۔ (ڈان، ۱۰ نومبر ۶۰ء)

اس سے ظاہر ہے کہ دین کے ان تصورات اور اسلامی نظام کے اس اصل الاصول کو مسلم ممالک میں کس قدر تحسین و تائید کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے۔ طلوع اسلام اپنی اس خوش بختی پر جس قدر بھی فخر کرے کم ہے کہ دین کے ان تصورات اور اسلامی نظام کی اس اصل عظیم کو سب سے پہلے پیش کرنے کی سعادت اس کے حصے میں آئی تھی۔ دیکھئے! زمانے کے تقاضے کس طرح مسلمانوں کو پھر سے قرآن کے قریب لا رہے ہیں۔ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (۶۱/۸)


علامہ احمد امین مصری (مرحوم) کی علمی و تاریخی کاوشوں کا شاہکار

# فجر الاسلام

جسے مولانا عمر احمد صاحب عثمانی نے اُردو زبان کا لباس پہنایا

ضخامت نو سو صفحات ——— قیمت آٹھ روپے

مکتبہ طلوع اسلام - ۲۷/بی - شاہ عالم مارکیٹ - لاہور

# باب المراسلات

## ۱۔ بے بصر کی بصیرت

یوں تو وہ کون سا دن ہے جب میری ڈاک میں عجیب و غریب خطوط نہیں ہوتے، لیکن پچھلے دنوں ایک ایسا خط ملا جو اپنی نوعیت کا پہلا خط تھا۔ بڑے سائز کے لفافے کے اندر، دبیز آرٹ پیپر کے دو ورق جن پہ ایک حرف بھی لکھا ہوا نہ تھا لیکن دونوں ورق، کسی طرح سوئیوں سے چھدے ہوئے۔ حیران کہ یہ لفافے سے کیا نکلا؟ لفافے کو دوبارہ دیکھا تو اس میں سے ایک اور ورق نکلا جس پر لکھا تھا:

قبلہ محترم پرویز صاحب

السلام علیکم! ؎ زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

نابینا طالب علم کا ایک خط پیش خدمت ہے۔ اس کے شوق و محبت کا اندازہ لگائیے کہ اس نے یہ جاننے کے باوجود کہ آپ بریل نہ پڑھ سکیں گے آپ کو بریل میں خط لکھا۔ میرا کام اس کے پیغام کو نقل کر کے آپ تک پہنچا دینا ہے۔ والسلام

نیاز مند

اختر مسلم۔ (کراچی)

اس سے پتہ چلا کہ سوئیوں کے چھید، بریل کی وہ طرز تحریر ہے جسے ان لوگوں کیلئے ایجاد کیا گیا ہے جو بینائی سے محروم ہو چکے ہوں۔ یہ خط ایک ایسے نابینا بچے کا تھا جو کراچی کے IDA RIEU POOR WELFARE ASSOCIATION کے زیر اہتمام؛ صمٌ۔ بکمٌ۔ عمیٌ۔ بچوں کے لئے جاری ہے۔ خط کا مضمون یہ تھا:۔

پہلی بار عریضہ ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ امید ہے جواب سے ممنون فرمائیں گے۔

یوں تو ریڈیو پر درس قرآن اور اسلام کے متعلق مختلف موضوعات پر تقاریر سنتا اور سنتا رہتا ہوں لیکن یقین

مانتے ۔ جو کچھ "اسلام" کہہ کر پیش کیا جاتا ہے قلب کو اس سے اطمینان حاصل نہیں ہوتا ۔ پھر صحیح اسلام کیا ہے یہ جاننے کے لئے ایسی کتب کا مطالعہ ضروری ہے جو صحیح قرآنی تعلیمات کی آئینہ دار ہوں لیکن بدقسمتی سے نابینا دلیل کے طریقہ تحریر (بریل) میں ایسی کوئی کتاب نہیں جس سے نابینا فائدہ اٹھا سکیں ۔ اس دوران محمد اختر مسلم صاحب کا بحیثیت فیلڈ آفیسر تقرر ہوا ۔ انہوں نے اسکول کے خارجی امور کے علاوہ داخلی امور میں بھی دلچسپی لی ۔ انہوں نے اسلام کے موضوع پر ہم سے تبادلہ خیال کیا ۔ ان نشستوں میں موصوف نے بڑے آسان اور سیدھے سادے پیرائے میں ہمیں بتایا کہ اسلام کیا ہے ۔ اس کے علاوہ سلیم کے نام آپ کے تمام خطوط لفظاً لفظاً پڑھ کر سنائے ۔ ان خطوط نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ۔ لیکن یہ سب کچھ تو آپ نے آنکھ والوں کے لئے کیا ہے ۔ ہمیں جب تک کوئی پڑھ کر نہ سنائے ہم اس سے فائدہ کیونکر اٹھا سکتے ہیں ۔ لہٰذا میں آپ سے درخواست کروں گا کہ کم از کم مہینہ میں ایک تقریر ہی ریکارڈ میں ہمیں محفوظ کرا کے بھیج دیں ۔ موضوعات کا انتخاب آپ سے بہتر کون کر سکتا ہے ۔ علاوہ ازیں اگر اس تقریر کو تحریری شکل میں روانہ فرما دیا کریں تو میں اس کو اپنے طریقہ تحریر میں لکھ کر دیگر ساتھیوں کیلئے محفوظ کر دوں گا ۔ اور رفتہ رفتہ یہ ایک کتاب بن جائے گی ۔

اس سے پہلے اختر مسلم صاحب نے اس امر کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرائی ۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ "جونہی موجودہ مصروفیات سے فرصت ملی طلباء کے لئے تقاریر محفوظ کر دوں گا"

لیکن شعر کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

جہاں تک میرا خیال ہے ہمارے لئے مختصر تقاریر آپ کا زیادہ وقت نہ لیں گی ۔ مجھے امید ہے کہ اپنی مصروفیات کے باوجود جواب سے ضرور مستفیض فرمائیں گے ۔ والسلام

طالب التفات ۔ غفار عزیز (نابینا)

خط میں کچھ ایسا خلوص تھا کہ بے ساختہ مکتوب نگار کو ملنے کو جی چاہا میں نے جواب میں مختصر سی رسید بھیج دی اور لکھ دیا کہ میں عنقریب کراچی آؤں گا تو زبانی بات کروں گا چنانچہ جب میں گذشتہ ماہ کراچی گیا تو اختر مسلم صاحب اس عزیز کو اپنے ہمراہ لے آئے ۔ خط سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ مکتوب نگار اچھی خاصی پختہ عمر کا ہے لیکن عزیز موصوف کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ اس کی عمر بمشکل ۱۷ سال کی تھی ۔ نہایت مستعلیق انداز کا ہونہار بچہ ۔ لباس اور وضع قطع میں سادگی، صفائی اور متانت خیالات بلند، جذبات پاکیزہ، ذہن صاف، باتیں پختہ، قرآنی فکر سے بڑی حد تک آشنا ۔ ذوق و شوق کا یہ عالم کہ اس کا جی چاہے کہ میری ساری کتابیں بیک وقت ازبر کر لے معلوم ہوا کہ پیدائشی نابینا ہے ——— بلکہ وہ دو بھائی ہیں اور دونوں پیدائشی نابینا ——— سب سے بڑی خوبی یہ کہ وہ اپنی اس محرومی کے متعلق ایک بار بھی حرف شکایت زبان تک نہیں لایا ۔ بلکہ بار بار یہ کہتا رہا کہ میں اپنی اس کمی کو دوسرے طریقوں سے پورا کر کے اپنی خداداد صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا ارادہ رکھتا ہوں ——— امن

کے اس عزم میں بڑی پختگی کی جھلک محسوس ہو رہی تھی اس نے طے یہ کیا کہ میں اپنی کتابیں اسے بھیجتا رہوں مسلم صاحب اسے پڑھ کر سنائیں گے۔ وہ انہیں بریل میں منتقل کرے گا اور اس طرح دوسرے نابینا بچے بھی اس قرآنی فکر سے مستفید ہو سکیں گے۔ مجھے اس سے اس قدر خوشی ہوئی کہ میں نے اس عزیز کو گلے سے لگا لیا اور اس کے عزم اور ہمت کی بے ساختہ داد دی میں نے اسے چند ایسی شخصیتوں کے حالات سنائے جنھوں نے بصارت (بلکہ سماعت اور نطق تک) سے محروم ہونے کے باوجود، عجیب کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ عزیز موصوف نے بھرپور آواز میں کہا کہ آپ انشاء اللہ مجھے انہی میں سے پائیں گے مجھے یقین ہے کہ اس کی یہ آرزو پوری ہو کر رہے گی۔

دنیا میں وہ لوگ بھی ہیں ـــــ اور اکثریت انہی کی ہے ـــــ جو سب کچھ میسر ہونے کے باوجود ہمیشہ روتے دکھائی دیں گے اور ان کی ساری عمر اپنی کوتاہ ہمتی کو مختلف قسم کی معذوریوں کے پردوں میں چھپانے میں ضائع ہو جائے گی ـــــ اور یہ لوگ بھی ہیں جو اتنی بڑی طبعی کمی کو اپنے عزائم کے راستے میں ایک ثانیہ کے لئے بھی حائل نہیں ہونے دینا چاہتے۔ یہی لوگ ہیں جو ہزار قسم کے موانع کے باوجود، دنیا میں کچھ کر کے دکھاتے ہیں ـــــ اور زندہ وہی ہیں جو کچھ کر کے دکھائیں۔

پرویز

**طلوع اسلام** علامہ اسلم جیراجپوریؒ نے، آج سے قریب تیس سال پہلے، ایک مقالہ لکھا تھا جس میں بتایا تھا کہ ہماری تاریخ میں، کتنی کتنی بڑی شخصیتیں ایسی گذری ہیں جو بینائی سے محروم تھیں۔ ہم اپنے اس نابینا عزیز کے استفادہ کے لئے اس مقالہ کو (بلا ادنیٰ تصرف) شائع کرتے ہیں تاکہ وہ دیکھے کہ اسے کیسی کیسی عظیم شخصیتوں کی معیت حاصل ہے۔ اس مقالہ کا مطالعہ طلوع اسلام کے دوسرے قارئین کے لئے بھی فائدہ سے خالی نہیں ہوگا۔

(۲)

## ۲۔ آخری سہارے

اکتوبر کے شمارہ میں شائع شدہ، محترم عنایت اللہ کی آپ بیتی، بعنوان "آخری سہارے" کے متعلق مختلف گوشوں سے تحسین و تبریک کے خطوط موصول ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک خط ہدیہ قارئین کیا جاتا ہے۔ مکتوب نگار ہیں، محترم چوہدری فیروز الدین صاحب، ہیڈ ماسٹر، ڈسٹرکٹ بورڈ اسکول۔ سکھوچک۔ وہ لکھتے ہیں:۔

حالیہ شمارہ طلوع اسلام میں "آخری سہارے" پڑھا۔

محترم عنایت اللہ صاحب کی "آپ بیتی" اور "جگ بیتی" یک جا کار فرما ہیں۔

عنایت اللہ صاحب کی رہائی تاکے ذریعہ صرف سات برس کی قید سے ہوئی۔

لیکن ان کو عمر قید سے رہائی کس نے دلوائی؟

صرف انہیں ہی نہیں ہم ایسے بہت سے بے بس، درماندہ، عاجز و ناچار، بے کس انسانوں کو دنیا والوں

کی خود ساختہ دوزخ سے نکلنے کی کس نے نشان دہی کی؟ اور کس نے ہمیں خدائی جنت کے دروازے پہ لا کھڑا کیا؟ یہ پرویز صاحب کی تحریر سحر طراز ہے جس کے صدقے ہم رطب اللسان ہیں۔

ہے یہ اک شخص کے تصور سے
ورنہ رعنائی خیال کہاں

اشاعت کے اس سلسلہ میں آپ میرا ہدیۂ تشکر قبول کیجئے۔ اور عنایت اللہ صاحب کو میری طرف سے قید سے رہائی اور "آخری سہارے" لکھنے پر مبارکباد بھیج دیجئے۔ دعا ہے کہ پرویز صاحب مزید کئی سال تک انسانوں کی زندگیوں کے لئے قرآنی سہارے۔ تلاش کرتے رہیں۔ اور انہیں غلط مذہب کی پہنائی ہوئی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں سے آزاد کر کے جنتِ ارضی میں رہنے کے قابل بنا دیں۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین آباد

طلوعِ اسلام

ہمیں امید ہے کہ محترم عنایت اللہ صاحب اس "آپ بیتی" کے دوسرے گوشوں سے بھی قارئین طلوعِ اسلام کو شناسا ہونے کا موقعہ دیں گے اور یہ بتائیں گے کہ ان کے دل کی گہرائیوں میں اترے ہوئے قرآنی نقوش نے کن کن تاریکیوں میں ان کی راہ نمائی اور دستگیری کی۔

---

## صدرِ پاکستان کی تقریر

کراچی سے محترم اکمل امام صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں۔

میں نے بڑے دکھ کے ساتھ یہ بات محسوس کی کہ انقلاب کی دوسری سالگرہ کے موقع پر صدر ایوب کی تاریخی تقریر کی اہمیت کے باب میں، ہمارا قومی پریس بڑی حد تک خاموش رہا۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے اسلام کے نظریۂ حیات (اسلامی آئیڈیالوجی) کو ذہنی طور پر قبول نہیں کیا یا پھر یہ کہ ابھی اس سنجیدہ تفکر کا دور شروع نہیں ہوا جس کا صدر ایوب نے اپنی تقریر میں ذکر کیا تھا۔

میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے طلوعِ اسلام کے شمارہ نومبر میں اپنے اداریہ میں اس تقریر کی اہمیت کا حقیقی تجزیہ پیش کیا اور اسی کے ساتھ محترم کشفی صاحب کا مضمون بھی شائع کیا۔ میں آپ کے خیالات اور کشفی صاحب کے تجزیہ سے پوری طرح متفق ہوں، لیکن ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ محترم و مکرم صدرِ مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ اسلامی آئیڈیالوجی کا مطالعہ کیا ہے اور اسے سمجھا بھی ہے — ان کی فکر مقید نہیں اسی لئے انہوں نے واشگاف الفاظ میں یہ بات کہہ دی ہے کہ ہم دوسروں کے افکار کو راستے کی رکاوٹ نہیں بننے دیا جائے گا ...... صدرِ محترم نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ماضی میں سیاست دانوں اور مفاد پرستوں نے اسلامی آئیڈیالوجی کو

اپنے مفادات کی خاطر کس کس طرح استعمال کیا ہے اور اس مسئلہ کو اُلجھا دیا ہے۔

اس مرحلہ پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیونکر ہوا؟ آخر اسلامی نظریہ کی تعبیر، خوابِ پریشاں کی تعبیر کیوں بن گئی؟ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی آئیڈیالوجی کے بنیادی خدوخال پر سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کیا گیا۔ آج بھی مختلف افراد اور گروہ اسلامی نظریہ کو اپنے اپنے رنگ میں پیش کر رہے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ؎

ہر اک کی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے!
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

قرآن کریم نے بھی اس حقیقت کو اپنے مخصوص انداز میں کئی مقامات پر پیش کیا ہے۔

میرا ایمان ہے کہ اگر ہم قرآن کریم کو اسلامی آئیڈیالوجی کی واحد اساس تسلیم کر لیں تو اس حقیقتِ کبریٰ یعنی اسلامی نظریہ کے متعلق بھانت بھانت کی بولیاں ختم ہو جائیں گی۔ قرآن کا تو دعویٰ یہی ہے کہ اس کتاب میں کوئی اختلاف نہیں اور اس کے احکام وحدت پیدا کرتے ہیں، تفریق نہیں۔

میں یہی عرض کرنا چاہتا تھا کہ جہاں جہاں صدرِ محترم نے اسلام کے غیر متبدل اصولوں کا تذکرہ فرمایا ہے، وہاں "مگر قرآن" کا لفظ رکھ دیا جاتا تو بات بہت واضح ہو جاتی۔ مجھے یقین ہے کہ صدرِ محترم کے ذہن میں یہ بات بڑی واضح اور مستحکم ہے کہ قرآن کریم ہی اسلامی آئیڈیالوجی کی بنیاد ہے۔ یہ بات "ظن" "وجدان" یا "الہام" کی بنیاد پر نہیں کہہ رہا، ظاہر ہے کہ قرآن کو قولِ فیصل سمجھنے والا حقیقتوں کو مانتا ہے ظن کو نہیں) بلکہ اُن کی تمام تقاریر اور انقلاب کی دوسری سالگرہ کا یہ خطاب اس حقیقت کو خود واضح کرتا ہے۔

صدرِ محترم نے فرمایا ہے کہ اسلاف کی رائے اور بصیرت ہمارے راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ علماء کے اجتماع میں اس سے پہلے وہ یہ بھی فرما چکے ہیں کہ اسلام کا کمال یہ ہے کہ اس نے بتوں کو توڑا، مسلمانوں کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کو بھی ایک بت بنا دیا۔ اس ایک جملے میں مسلمانوں کی ذہنی گمراہی کی پوری تاریخ سمٹ آئی ہے۔ ہم نے اپنے اوہام، یہودیوں کی روایات اور کمزور اقوال کو، جو سراسر قرآن کے خلاف جاتے ہیں قرآن کریم کا درجہ دے دیا ہے۔

آپ کے اداریہ اور کشفی صاحب کے مضمون میں، میں نے جو خلا یا کمی محسوس کی، غالباً اس کا اظہار کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ کیا آپ اس مسئلہ کی مزید وضاحت فرمائیں گے یعنی یہ کہ جب ہم اسلام کے غیر متبدل اصول کہتے ہیں تو اس سے مراد وہی اصول ہوتے ہیں جو قرآن کے اندر محفوظ ہیں، نہ کہ اس "اسلام" کے اصول جس کا تصور ہر شخص کے ذہن میں الگ الگ ہے اور جس کی سند کسی نہ کسی پیشرو تک پہنچ کر رُک جاتی ہے؟

**طلوعِ اسلام** | اس بات میں تو دو آراء ہو ہی نہیں سکتیں کہ جب اسلام کے غیر متبدل اصول کہا جائے گا

تو اس سے مراد قرآن سے کریم کے غیر متبدل اصول ہوں گے۔ اس حقیقت کو وہ حضرات بھی تسلیم کرتے ہیں جو فقہ یا روایات کے احکام کو غیر متبدل مانتے ہیں۔ مثلاً سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی اپنی کتاب تفہیمات حصہ اول (ص ۳۳۹) میں لکھتے ہیں:۔

> علاوہ بریں، روایات کے اختلاف سے صرف فروع میں اختلاف واقع ہوتا ہے۔ باقی رہے اصول دین تو وہ سب کے سب کتاب اللہ میں موجود ہیں جو روایات سے بالاتر اور تمام مسلمانوں میں مشترک ہے

لہٰذا جب صدرِ پاکستان کہتے ہیں کہ اسلام کے اصول غیر متبدل ہیں، تو اس سے ان کی مراد لامحالہ وہی اصول ہیں جو قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ قرآن کے باہر دین کا کوئی اصول نہیں۔

ویسے ہم اس سے متفق ہیں کہ "اسلام" کے بجائے "قرآن" کہنے سے بات واضح اور متعین ہو جاتی ہے۔

---

# نقد و نظر

## ۳۔ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء

علمی اور اسلامی دنیا میں شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ (محدث دہلوی) کا جو مقام ہے وہ محتاجِ تشریح نہیں۔ انہوں نے مسئلہ خلافت پر فارسی زبان میں ایک جامع تصنیف قلمبند فرمائی تھی جس کا شمار اس موضوع کی بلند ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب عرصے سے نایاب تھی۔ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ کراچی نے اس کتاب کو مع اردو ترجمہ کے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ ترجمہ مولانا عبدالشکور (مرحوم) کا کیا ہوا ہے۔ ترجمے کے علاوہ انہوں نے جا بجا تشریحی نوٹس بھی دیئے ہیں جن سے مشکل مقامات آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ ترجمہ اور تشریحی نوٹس میں دیانتی کاوش سے کام لیا گیا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب صرف جلد اول ہے اور ناشرین اسے چار جلدوں میں مکمل کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے خیال میں بہتر ہوتا کہ اصل کتاب کو الگ شائع کر دیا جاتا اور اردو ترجمہ الگ۔ تاکہ جو اہلِ علم طلبہ اصل کتاب کے مطالعہ کی استعداد رکھتا ہے اسے خواہ مخواہ اردو ترجمہ خریدنا نہ پڑتا۔ اور جو لوگ صرف اردو ترجمے کے مطالعہ پر اکتفا کرنا چاہتے انھیں اصل کتاب خریدنا نہ پڑتی۔ بہرحال، اب اصل اور ترجمہ ایک ہی جگہ ہے یہ پہلی جلد بڑے سائز کے چھ سو صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت مجلد دس روپے ہے۔

---


**کراچی کے دوستو!**

آؤ اور ہر اتوار کی صبح ۹ بجے اسنا بعد آسمبلی ہال (متصل سعید منزل) بندر روڈ میں مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب سے سنو کہ قرآن کریم ہماری معاشرتی، سیاسی اور معاشی مشکلات کا کیا حل پیش کرتا ہے۔ قرآن کی بات، مفکرِ قرآن کی زبان سے —— (بزمِ طلوعِ اسلام کراچی کے زیرِ اہتمام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# وَالعَصْر

## [کلرک ہال کراچی کی تقریر]

پرویز

### مظاہر فطرت کی شہادت

قرآن کریم زندگی کے جو حقائق پیش کرتا ہے ان کی تائید میں کبھی مظاہر فطرت کی شہادت پیش کرتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا۔ اس حقیقت کبریٰ پر شاہد ہے آفتاب جہانتاب اور اس کی ضیا باریاں۔ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا۔ اور چاند اور اس کا روشنی حاصل کرنے کے لئے سورج کے پیچھے پیچھے پھرنا۔ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا۔ دن اور اس کی جلوہ فروشیاں۔ وَاللَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا۔ رات اور اس کی ظلمت انگیزیاں، جب وہ روشنی کی ہر نمود کو اپنی تاریکی کی چادر میں لپیٹ لیتی ہے۔ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا اور فضا کی بلندیاں اور جو کچھ ان میں بنا ہے۔ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا (۹۱/۱-۶)۔ اور زمین اور جس طرح سے گول ہونے کے باوجود پھیلا دیا ہے۔ یہ سب اس عظیم حقیقت پر شاہد ہیں کہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (۹۱/۹-۱۰)۔ جس نے انسانی ذات کو نشو ونما دی وہ کامیاب و کامران ہو گیا جس نے اسے (اپنی مفاد پرستیوں کے ڈھیر کے نیچے) دبائے رکھا" اس کی کشتِ حیات ویران ہو گئی۔

کہیں ہے وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ (۸۵/۱) فضا کی بلندیوں میں نمایاں ہونے والے ستاروں کے مقامات و منازل اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ دوسری جگہ ہے۔ وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ (۸۶/۱)۔ فضا کی بلندیاں اور ستارۂ صبح کی نمود اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ (۸۶/۴)۔ کوئی متنفس ایسا نہیں جس پر (خدا کا قانونِ مکافات) بطور نگران مقرر نہیں۔

کہیں اور وضاحت سے کہہ دیا گیا ہے کہ فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ۔ بات یوں نہیں جس طرح یہ لوگ سمجھے بیٹھے ہیں۔ میں اپنے

دعوے کو بلا دلیل پیش نہیں کرتا میں شہادت میں پیش کرتا ہوں ان ستاروں کو جو دبے پاؤں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے رہتے ہیں۔ اَلْجَوَارِ الْكُنَّسِ۔ اور ان تیز خرام سیاروں کو جو اپنی منزل طے کر کے چھپ جاتے ہیں۔ وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ۔ اور رات کو جب وہ خاموشی سے آتی اور خاموشی سے چلی جاتی ہے۔ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ۔ اور صبح کو جب وہ حیاتِ نو کا پیغام لے کر آتی ہے۔ ان تمام مظاہرِ فطرت کو جو غیر متبدل قوانینِ خداوندی کے مطابق سرگرمِ عمل رہتے ہیں اس حقیقت پر بطور شاہد پیش کرتا ہوں کہ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (۸۱/۱۹) یہ جو ہماری وحی کی بات تم سے کہہ رہا ہے، پیارا پیغامبر ہے اور نہایت معزز پیغامبر۔

کہیں وہ مظاہرِ فطرت کو بطور شاہد پیش کرتا ہے اور کہیں تاریخ انسانیت کو۔ اس کے نزدیک تاریخ کی اہمیت اس قدر ہے کہ وہ

**تاریخی شواہد**

کہتا ہے کہ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ .... (۲۴/۳۴) اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے تمہاری طرف ایسے قوانین نازل کئے ہیں جو بات کو وضاحت سے بیان کرتے ہیں اور ان کے ساتھ ان لوگوں کی تاریخ جو تم سے پہلے ہو گذرے ہیں۔ اسی کے لئے وہ بار بار کہتا ہے کہ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۴۷/۱۰)۔ کیا ان لوگوں نے دنیا میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ ان قوموں کا انجام کیا ہوا جو اس سے پہلے ہو گذری ہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح خارجی کائنات میں ہر شے کی موت اور زندگی کے لئے اٹل قوانین مقرر ہیں اسی طرح قوموں کی حیات و ممات کے لئے بھی غیر متبدل قوانین متعین ہیں۔ جو قوم خدا کے متعین کردہ حیات بخش قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے گی وہ زندگی اور اس کی شادابیوں اور سرفرازیوں سے بہرہ یاب ہو گی۔ جو ان کے خلاف اپنے وضع کردہ آئین کے مطابق چلے گی، وہ محتاجی کی زندگی جئے گی اور ذلت کی موت مرے گی۔

**وَالْعَصْرِ**

تاریخی شواہد کی یہی وہ اہمیت ہے جسے قرآن کریم نے ایک لفظ میں سمیٹ کر رکھ دیا جب کہا کہ

وَالْعَصْرِ (۱۰۳/۱)

زمانہ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ..... زمانے سے مراد یہاں تاریخِ انسانیت ہے۔ یعنی تم انسان کی تاریخ پر بہ ہیئت مجموعی نظر ڈالو تو یہ حقیقت تمہارے سامنے آجائے گی کہ

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ (۱۰۳/۲)

"انسان ہمیشہ خسارہ میں رہا ہے"۔

قرآن کریم کے مختلف مقامات پر غور کرنے سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ جب وہ انسان کے متعلق کوئی بات کہتا ہے تو

**"انسان" سے مراد**

اس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان خدا کی وحی کو چھوڑ کر جب بھی اپنے خیالات اور نظریات کے تابع چلا ہے اس کی یہ حالت ہوئی ہے۔ اور جب بھی وہ ایسا کرے گا۔ اس کی یہی حالت ہو گی۔ مثلاً وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا (۱۷/۱۱) انسان خیر و شر میں بھی تمیز نہیں کر سکتا۔ وہ خیر کی جگہ شر کو آواز دے دے کر بلاتا ہے۔ وہ ہے ہی بڑا جلد باز۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (۱۸/۵۴) بڑا ہی جھگڑالو

ہے۔ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ (۱۶/۴) کھلا کھلا جھگڑا کرنے والا اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (۳۳/۷۲) ظالم اور جاہل۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا (۷۰/۱۹)۔ بڑا بے صبرا۔ ایسا کہ اس کی نیت ہی نہیں بھرتی۔ قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَا اَكْفَرَهٗ (۸۰/۱۷) بڑا ہی ناشکرا۔ یہ ہے انسان کی حالت جب وہ وحی کا دامن چھوڑ کر اپنی مرضی کے مطابق چلتا ہے۔ جب وہ یہ روش اختیار کرتا ہے تو اس کا نتیجہ سوائے تباہی اور بربادی کے کچھ نہیں ہوتا۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی شہادت انسان کی پوری تاریخ دیتی ہے۔

## قرآنی مثال

تاریخ انسانیت انسانی سعی وکاوش اور اس کے نتائج وثمار کا کیا نقشہ پیش کرتی ہے اسے قرآن کریم نے ایک حسین وجمیل انداز میں ایک مثال سے یوں سمجھایا ہے کہ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا (۱۶/۹۲) دیکھنا! تمہاری مثال اس عورت کی سی نہ ہو جائے جس نے بڑی محنت سے سوت کاتا اور پھر خود اپنے ہی ہاتھوں سے) اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ (جیسا کہ میں نے ایک عرصہ ہوا لکھا تھا) قرآن کریم کی اس چھوٹی سی مثال کو سامنے رکھیے اور پھر تاریخ کے اوراق پر غور کر کے دیکھیے کہ عبرت و موعظت کی کتنی تاسف انگیز اور جگر پاش داستانیں ہیں جو اس کے اندر لپٹی ہوئی ہیں۔ اور انسانی نامرادیوں اور ناکامیوں کے کس قدر جانکاہ حوادث و وقائع ہیں جو اس میں پوشیدہ ہیں۔ ہر دور کے انسان کی جدوجہد اور سعی وکاوش کی تاریخ کو سامنے لائیے۔ وہ اپنے لئے عظیم الشان نظامِ تمدن تعمیر کرتا ہے۔ اس فلک بوس و دلکشا نگیر عمارت کے لئے بہ ہزار محنت قسم قسم کے زادرات جمع کرتا ہے۔ وہ عمارت اس کے حسین تصورات کی مرکز۔ اس کی شاداب آرزوؤں کا محور۔ اور اس کی گلپوش

## انسانی سعی وکاوش کی عبرت سامانیاں

تمناؤں کی آماجگاہ بنتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس عمارت کی تکمیل میں انسانیت کے ارتقاء کا راز پنہاں ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا وجود دنیا کی ستائی ہوئی انسانیت کے لئے ابرِ رحمت اور سحابِ کرم ہے جو اس کے عدم سکون کی آگ کو تسکین و طمانیت کی جنت سے بدل دے گا۔ وہ ایک عرصہ تک اپنے ان تصورات کی دنیا میں محو اور اس قصرِ رفیع الشان کی تکمیل، تزئین اور آرائش میں سرگرداں رہتا ہے اور جوں جوں اس کی دیواریں اوپر کو ابھرتی ہیں اس کی مسرتوں میں بالیدگی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ لیکن وہ عمارت ہنوز تکمیل تک بھی نہیں پہنچنے پاتی کہ دنیا اس عبرت انگیز تماشا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے کہ وہی انسان اس عظیم و حسین عمارت کو خود اپنے ہاتھوں سے زمین پر گرا دیتا ہے اور یوں اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا وہ حسین وجمیل مرکز، خاک کا ڈھیر بن جاتا ہے اور اس کے بعد اس کے کھنڈرات اپنے مٹے ہوئے نقوش سے آنے والوں کو اپنی حدیثِ الم سے آگاہ کرنے کے لئے باقی رہ جاتے ہیں۔ بابل اور نینوا، مصر اور یونان، چین اور ترکستان۔ روم اور ایران کے کھنڈرات کو چشمِ عبرت سے دیکھئے اور پہچانیئے کہ وہ کیسے کیسے عظیم المرتبت تمدنوں کے بھیانک مدفن ہیں۔ پہچانیئے اور سوچئے کہ انسان نے اپنی محنت سے کاتے ہوئے سوت کو کس طرح بار بار خود اپنے ہاتھوں سے بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ پھر آگے بڑھیئے اور ان کے در و دیوار کے مٹے ہوئے نقوش کو دیدۂ عبرت سے پڑھیئے اور دیکھئے کہ کیا ان کی ایک ایک اینٹ پر آپ کو یہی لکھا ہوا نہیں ملتا کہ

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔

لیکن اگر آپ تاریخ کی ان کہنہ داستانوں کی ورق گردانی، اور اقوامِ سابقہ کے اجڑے ہوئے کاشانوں کی عبرت سامانی سے غلط بنیادوں پر اٹھی ہوئی تہذیبوں کے مآل و انجام تک پہنچنے کی زحمت گوارا نہیں کرنا چاہتے تو ایک نظر خود اپنے زمانے کی اُس نو تہذیب و تمدن پر ڈال لیجئے جس کی چمک دمک نے اقوامِ عالم کی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر رکھی ہے۔ ہمارا دور تہذیبِ مغرب کا دور کہلاتا ہے۔ اس تہذیب کی سطوت و ثروت اور دبدبہ و طنطنہ کا یہ عالم ہے کہ فطرت کی بڑی بڑی مہیب و نہیب قوتوں کو انسان نے مسخر کر لیا ہے۔ سامانِ رسل و رسائل اور ذرائع آمد و رفت کی محیر العقول برق رفتاری سے دنیا کی طنابیں کھنچ گئی ہیں۔ سمندر ان کے تابع فرمان ہیں۔ پہاڑ ان کے حضور سجدہ ریز ہیں۔ زمین ان کے پاؤں کی ٹھوکروں سے اپنے دبے ہوئے خزانے اگل رہی ہے۔ آسمان کی بجلیاں ان کے اشاروں پر ناچتی ہیں۔ ایٹم کی عبقری جناتی توانائیاں ان کی مٹھی میں ہیں۔ وہ چاند اور سورج کو اپنے زیرِ دام لا رہے ہیں۔ وہ کہکشاں پر کمندیں پھینکنے کی سوچ رہے ہیں۔ انسان کو اپنی ساری تاریخ میں کبھی اس قدر کائنات گیر قوتیں حاصل نہیں ہوئی تھیں۔

## تہذیبِ مغرب

سوال یہ ہے کہ کیا اس قدر بے پناہ قوتوں کا حامل انسان، اپنے آپ کو کامیاب و کامران تصور کرتا ہے یا یہ بھی ناکامیوں اور نامرادیوں کے ہجوم میں لَفِیْ خُسْرٍ کا عبرت انگیز مرقع بن رہا ہے؟ آئیے! خود دانایانِ فرنگ سے پوچھیں کہ وہ اپنے متعلق کیا کہتے ہیں اس لئے کہ جو کچھ وہ خود اپنے متعلق کہیں گے اس سے زیادہ معتبر شہادت اور کس کی ہو سکے گی۔ یہی شہادت، وَالْعَصْرِ کی زندہ تفسیر اور وحی کو چھوڑ کر خود تراشیدہ روش پر چلنے والے انسان کے خوابِ زندگی کی تعبیر ہوگی۔

## عصرِ حاضر کی شہادات

مغرب کا ایک مفکر، ڈاکٹر میسن (J. W. T. MASON) اپنی کتاب (CREATIVE FREEDOM) میں لکھتا ہے۔

> ہم نے زندگی کی ابتداء سائنس کی کاریگری سے کی۔ اس وثوق کے ساتھ کہ مادی کامرانیاں زندگی کے عقدوں کو حل کر دیں گی۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم غلطی پر تھے۔ زندگی کے مسائل اتنے آسان نہیں۔

پروفیسر جوڈ لکھتا ہے۔

> اس زمانہ میں مشین نے انسان کو بے پناہ قوت دیدی ہے اور اس قوت سے وہ تعمیر و تخریب کے بے حد و حساب کام لے سکتا ہے۔ وہ چاہے تو سمندروں کو پھاڑ دے اور پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دے۔ آسمان اس کے سامنے گرد اور کائنات سرنگوں ہے۔ لیکن اتنی قوت پا کر بھی وہ سکھی نہیں بلکہ اور دکھی ہو گیا ہے۔ آج مشین کی طاقت انسان کو مطمئن کرنے کا کام نہیں دے رہی بلکہ الٹا اسے تباہ و برباد کر رہی ہے۔

اقبال کے الفاظ میں۔

اک شور ہے مغرب میں اُجالا نہیں ممکن
افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیاہ پوش

مشہور امریکی مورخ تہذیب (DORSEY) اپنی کتاب (CIVILISATION) میں اپنے عہد کی تہذیب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

ہماری موجودہ تہذیب اپنے قومی، معاشی، عائلی، اخلاقی، مذہبی، ذہنی نظام کے ہر شعبے میں حماقت، جہالت، فریب اور ظلم کا مستقل مظاہرہ ہے۔

اس دور تہذیب اور قدیم عہد جاہلیت میں جو فرق ہے اسے (ALDOUS HUXLEY) کے الفاظ میں سنئے۔ وہ لکھتا ہے۔

اس باب میں دور جاہلیت اور عہد حاضر میں بس یہ فرق ہے کہ ہم کھلے ہوئے تشدد کی دنیا سے فریب کاری کی دنیا کی طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ (ENDS AND MEANS)

یعنی عہد جاہلیت کا وحشی انسان جو کچھ کھلے بندوں کرتا تھا، ہمارے زمانے کا مہذب انسان وہی کچھ عقلِ حیلہ جو کی فریب کاریوں کے پردے میں کرتا ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ

جہانِ مغرب کے بتکدوں میں، کلیساؤں میں، مدرسوں میں
ہوس کی خوں ریزیاں چھپاتی ہے عقلِ عیار کی نمائش

## امریکہ کی حالت

یورپ میں اس تہذیب پر بڑھاپے کے آثار شروع ہو گئے ہیں لیکن امریکہ میں یہ ہنوز اپنے عہد شباب میں ہے اور وہ ملک اقوام عالم کی نگاہوں کا مرکز بن رہا ہے۔ لیکن یہ تہذیب اس ملک میں کس قسم کی نسل پیدا کر رہی ہے اس کے متعلق وہاں کے مشہور صاحب قلم (LEWIS MUMFORD) کا بیان ملاحظہ کیجئے۔ وہ اپنی کتاب (FAITH FOR LIVING) میں لکھتا ہے کہ

امریکہ میں ہم نے ایک نئی نسل پیدا کی ہے۔ عمدہ توانائی، خوبصورت جسم۔ لیکن دل بالکل خالی۔ وہ نسل جس کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں..... یہ نوجوان، "مہذب وحشی" حیوانوں کی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کبھی دھوپ میں پڑے آفتابی غسل لے رہے ہیں، کبھی بیکار جنسی میلان کی تحریک پر ناچنے لگ جاتے ہیں..... یہ لوگ کھاتے ہیں، پیتے ہیں، شادی کرتے ہیں۔ بچے پیدا کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ ایسی زندگی جی کر جو اگر کامیاب ہے تو زیادہ سے زیادہ حیوانی لذتیں حاصل کرنے کی۔ اور اگر ناکام ہے تو حسرت، خوف اور پریشانی کی۔ حیوانی سطح کی لذتوں کے علاوہ انہیں ہر طرح کی زندگی سے نفرت ہے۔ انہیں ان لذتوں سے محروم کر دیجئے تو ان کے لئے جینا وبالِ دوش ہو جائے۔

جب کام میں مصروف ہیں تو نیم مردہ۔ اور جب کام سے فارغ ہوں تو نیم زندہ۔ یہ ہے ان نوجوانوں کی زندگی کا مآل۔

ممفورڈ نے امریکہ کی نئی نسل کا جائزہ، معاشرتی نقطہ نظر سے لیا ہے لیکن جن مفکرین کی نگاہیں اور گہری میں اتری ہیں اور انہوں نے ان

نوجوانوں کی دل کی دنیا میں جھانکا ہے وہ اس کی ہولناک تاریکیوں سے چیخ اٹھے ہیں۔ آپ نے ڈاکٹر ینگ (JUNG) کا نام سنا ہوگا۔ وہ عصرِ حاضر کا مشہور علم النفس کا ماہر ہے۔ اس نے اپنی عمر بچوں اور نوجوانوں کی نفسیاتی کیفیت کے مطالعہ میں گذار دی۔ وہ اپنی مدت العمر کے تجربہ کے بعد دورِ حاضر کے انسان کے متعلق جس نتیجہ پر پہنچا ہے اس نے اپنی کتاب (MODERN MAN IN SEARCH OF SOUL) میں قلمبند کر دیا ہے۔ وہ اس کتاب میں لکھتا ہے۔

## ڈاکٹر ینگ کی شہادت

> عصرِ حاضر کا انسان مفلوج انسان ہے۔ اندھے حوادث کے مقابلہ میں خوف سے ہراساں۔ یعنی اُن حوادث کے مقابلہ میں ہراساں جن پر وہ اپنے دور کی سیاسی اور معاشی تدابیر کے زور پر قابو نہیں پا سکتا۔ یہ تو ہے اس کی خارجی حالت اور اگر وہ اس خارجی دنیا سے ہٹ کر اپنی داخلی دنیا کی طرف جھانکتا ہے تو وہاں اسے باہر سے بھی زیادہ تاریکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

اقبالؒ نے مدت ہوئی عصرِ حاضر کے مہذب انسان کی قلبی کیفیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا تھا کہ

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار — عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

وَالْعَصْرِ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ قرآن کریم جب انسان کے تباہ کن انجام کا ذکر کرتا ہے تو اس سے مراد ہوتی ہے وہ انسان، جو حق و صداقت کی بلند اقدار کو چھوڑ کر، اپنے خود تراشیدہ پیمانوں کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ اب آپ دیکھئے کہ مادی دنیا کی اس قدر بے پناہ قوتوں کو حاصل کر لینے کے باوجود، عصرِ حاضر کے انسان کی جو یہ کیفیت ہو گئی ہے مغربی مفکرین کی تحقیق کے مطابق، اس کی جڑ کیا ہے۔ اس باب میں تہذیب کا مؤرخ بریفالٹ (BRIFFAULT) اپنی معرکہ آرا تصنیف THE MAKING OF HUMANITY میں لکھتا ہے۔

## باطل نظام

> انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اس باطل نظام کو کیسے ہی حسنِ تدبیر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ اس کی بنیادی کمزوری، خارجی نظم و ضبط اور اِدھر اُدھر کی جزوی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی۔

اقبالؒ کے الفاظ میں۔

تدبّر کی فسوں سازی سے قائم رہ نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہو

پھر یہ لکھتا ہے۔

> اگر انسان بادلوں سے اونچا اڑنے لگ جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسانیت کی سطح بھی اتنی ہی بلند ہو گئی ہے۔ نہ ہی سو میل فی گھنٹہ کی رفتار کے معنی انسانی ترقی ہیں۔ انسان اگر ستاروں کے تولنے کے بھی قابل ہو جائے تب بھی اس کے جوہر ذاتی میں تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ انسانی معاملات اس سے کہیں گہرے ہوتے ہیں۔۔۔۔ وہ نظام تہذیب جس میں حق و صداقت کو عادی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہو، آخر الامر تباہ ہو کر رہتا ہے۔۔۔۔ وہ صحیح پیمانہ جس سے انسانی دنیا کی قدر و قیمت ناپی جا سکتی ہے، اخلاقی پیمانہ ہے۔

یہ اخلاقی پیمانہ صرف وحی کے ذریعے مل سکتا ہے، اور وحی پر ایمان ہی وہ قوت ہے جو انسان کو تباہیوں سے بچا سکتی ہے۔

## صرف ایمان سے حاصل ہو سکتا ہے

وَالْعَصْرِ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔

> جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ انسان ایمان کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے اسے دور حاضر کے نوجوانوں کی حالت کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ جو مضطربانہ اس تلاش میں پھر رہے ہیں کہ کوئی ایسی چیز مل جائے جس پر ایمان لایا جا سکے۔"

یہ الفاظ میرے نہیں۔ مغرب کے ایک مفکر، پروفیسر الفریڈ کوبن کے ہیں جسے اس نے اپنی کتاب (THE CRISIS OF CIVILISATION) میں درج کیا ہے۔

ڈاکٹر ینگ کے متعلق آپ اوپر دیکھ چکے ہیں کہ وہ ہزاروں نوجوانوں کے تجزیۂ نفس کے بعد کس نتیجہ پر پہنچا ہے۔ وہ اپنی اسی کتاب میں آگے چل کر لکھتا ہے۔

> میں نے اپنی زندگی کے نصف آخر میں جس قدر مریضوں کا تجزیۂ نفس کیا ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جسے زندگی کے مسائل کے لئے مذہبی زاویۂ نگاہ کی تلاش نہ ہو۔ ان میں سے ہر ایک کی بیماری کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اس شے کو ضائع کر دیا تھا جو "زندہ مذہب" انسان کو عطا کرتا ہے۔ ان کا علاج اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہیں پھر سے وہی شے دیدی جاتی جو ان سے گم ہو چکی تھی۔ یہی ان کی دوا تھی ۔۔۔ ایمان۔ امید۔ محبت۔ نگہ تودیں ۔۔۔

ایمان اور یقین ہی وہ مستحکم بنیاد ہے جس پر زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ عدم یقین کی زندگی، جہنم کی زندگی ہے۔

> یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی　　یقیں، اللہ مستی، خود گزینی
> سُن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار　　غلامی سے بہتر ہے بے یقینی　(اقبالؔ)

لیکن یہ ایمان اور یقین کس بات پر ہوگا؟ اس بات پر کہ انسانی زندگی اسی آب و گِل کی زندگی نہیں۔ انسانی زندگی، حیوانی سطح زندگی

## زندگی کی بلند اقدار

سے اوپر جا کر شروع ہوتی ہے اور اس کی نشوونما کے لئے بلند مستقل اقدار کی ضرورت ہے۔ یہ اقدار عقل انسانی مہیا نہیں کر سکتی۔ یہ وحی کے ذریعے معلوم ہو سکتی ہیں۔ آپ میں سے آئن سٹائن کا نام کس نے نہیں سنا؟ یہ ہمارے دور کا سب سے بڑا سائنسدان تھا۔ اس کی ساری عمر سائنٹیفک ریسرچ میں گذری۔ اس کے بعد اس نے اپنی عمر کے آخری ایام میں ایک کتاب لکھی جس کا نام ہی اس نے (OUT OF MY LATER DAYS) رکھا۔ وہ اس کتاب میں لکھتا ہے۔

> سائنس ہمیں صرف یہ بتا سکتی ہے کہ "کیا ہے؟" نہ یہ نہیں بتا سکتی کہ "کیا ہونا چاہیئے"۔ اس لئے زندگی کی اقدار متعین کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ یہ اس کے دائرے سے باہر کی چیز ہے۔۔۔۔ ہم نے تلخ تجارب کے بعد یہ سیکھا ہے کہ معاشرتی زندگی کی گتھیاں تنہا عقل کی رو سے نہیں سلجھ سکتیں۔ اس لئے ہمیں تنہا عقل کو اپنا خدا نہیں بنا لینا چاہیئے۔۔۔۔ یہ اقدار تجربات کے بعد بھی وضع نہیں کی جا سکتیں۔ یہ مقتدر ہستیوں کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ ان کی بنیادیں عقل پر نہیں ہوتیں لیکن وہ تجربہ کی کسوٹی پر بالکل پوری اترتی ہیں۔ اس لئے ہم صداقت کہتے ہی اسے ہیں جو تجربہ سے درست ثابت ہو۔

## تنہا عقل ناکافی ہے

مشہور مفکر برگسان کہتا ہے کہ

> انسان تنہا عقل کی روشنی میں صحیح راہ پر چل ہی نہیں سکتا۔ عقل اسے کسی دوسرے راستہ پر ڈال دیگی۔ عقل ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ جب ہم اسے اس مقصد سے بلند مقاصد کی طرف لے جانا چاہیں تو وہ اس بلند سطح کے متعلق امکانات کا سراغ دے سکے تو شاید وہ نہ وہ حقیقت کا پتہ کسی صورت میں بھی نہیں دے سکتی۔

(THE TWO SOURCES OF RELIGION AND MORALITY)

جب انسانی عقل وحی کی راہ نمائی میں راستہ چلے تو وہ کاروان انسانیت کو منزل مقصود تک پہنچا سکتی ہے (SHEEN) کے الفاظ میں:-

> جس طرح ہمارے حواس اُس وقت بہتر کام کرتے ہیں جب ان کی تکمیل عقل کے ذریعہ ہو جائے۔ اسی طرح ہماری عقل اس وقت بہتر کام کر سکتی ہے جب اس کی تکمیل وحی کے ذریعے ہو جائے۔ جو آدمی عارضی طور پر عقل سے عاری ہو جائے (مثلاً شرابی) اس کے حواس وہی ہوتے ہیں جو پہلے تھے لیکن اُس وقت وہ کبھی اپنے فرائض کو اس سرانجام نہیں دے سکتا جس طرح عقل رہ شخص کی حالت میں سرانجام دیتا ہے۔ جو حالت عقل کے بغیر حواس کی ہوتی ہے۔ وہی کیفیت وحی کے بغیر عقل کی ہوتی ہے۔ (PHILOSOPHY OF RELIGION)

اب ظاہر ہے کہ جو شخص شراب کے نشے میں چور ہو کر زندگی کے اہم معاملات کے فیصلے کرے اس کی تباہی اور بربادی میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ آج وحی کی راہ نمائی کو چھوڑ کر انسان کی حالت ایک شرابی کی سی ہو چکی ہے جو اپنے نفع اور نقصان میں تمیز ہی نہیں کر سکتا۔

اس کی کیفیت یہ ہے کہ

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

یہی وہ حالت ہے جس میں انسان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وَيَدْعُ الْإِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ (۱۷/۱۱) وہ اپنے نفع کی بجائے نقصان کو آوازیں دے دیکر بلاتا ہے۔ انسان کو ان نقصانات سے صرف وحی کی راہ نمائی بچا سکتی ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس پر زمانہ شاہد ہے اور جسے آج مغرب کے مفکر چلا چلا کر بیان کر رہے ہیں۔

وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا۔

---

**ایمان و عمل**

لیکن زندگی کی بلند اقدار کی صداقت کو تسلیم کر لینا ہی کافی نہیں۔ ان کے مطابق ماحول کو بدل دینا بھی ضروری ہے۔ بلند اقدار کی صداقت پر یقین اسی صورت میں نتیجہ خیز ہو سکتا ہے جب ان اقدار کو عملی معاشرہ میں متشکل کیا جائے۔ اس لئے قرآن کریم نے إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آمَنُوا کے ساتھ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ کا اضافہ بھی ضروری سمجھا ہے۔ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ کے معنی ہیں، غلط ماحول کو بدل کر ایسا نیا ماحول تعمیر کر دینا جو ان اقدار کی برومندی کے لئے مساعد اور خوشگوار ہو۔ ماحول کے بدلنے سے ہر چیز بدل جاتی ہے۔ برگساں اس باب میں کہتا ہے۔

> تم ماحول کو بدل دو اور ماحول تمہیں خود بخود بدل دے گا۔ انسان اُس دنیا کی مخلوق ہوتا ہے جس میں وہ رہتا ہے۔ جس قسم کی وہ دنیا ہوگی اُسی قسم کا انسان ہوگا۔ اخلاق اس کا نام نہیں کہ تم اپنے زمانے کے اخلاقی ضابطے سے ہم آہنگ ہو جاؤ (خواہ وہ کسی قسم کا ہو)۔ اخلاق کا مطلب یہ ہے کہ تم اُس اخلاقی ضابطہ کی غیر اخلاقی شقوں کے خلاف آواز بلند کرو۔

اور انہیں صحیح اقدار سے بدل دو۔ اس طرح ان لوگوں کے یقینِ محکم اور عملِ پیہم سے ایسا معاشرہ وجود میں آجائے گا جس میں باقی افراد (اور بعد میں آنے والے انسان) خود بخود حق و صداقت کے اصولوں کے پیچھے چلتے جائیں گے۔ قرآن کریم اسے "اقامتِ صلوٰۃ" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ پروفیسر جوڈ اس معاشرہ کے متعلق لکھتا ہے۔

> مثالی معاشرہ وہ ہے جس میں ہر شخص وہ کام کرنا چاہے جسے وہ حق سمجھتا ہے اور ہر شخص اسی کو حق سمجھے جو درحقیقت حق ہے..... جس معاشرہ کے افراد ان اقدار کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دیں گے اور ان پر عمل پیرا ہوں گے وہی معاشرہ بہترین معاشرہ ہوگا۔
>
> GUIDE TO THE PHILOSOPHY OF MORALS AND POLITICS

الا الذین آمنوا و عملوا الصالحات۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں قرآن اَلسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ کہہ کر پکارتا ہے۔ جب تک اس قسم کے

لوگوں کا ایک گروہ وجود میں نہ آجائے، نوع انسانی تباہیوں اور بربادیوں سے کبھی محفوظ نہیں رہ سکتی۔ جارجیا کا مشہور صوفی مفکر اور اوسپنسکی کا گرو، گرجیف اپنی کتاب (ALL AND EVERYTHING) میں لکھتا ہے کہ

انسانیت کا ارتقاء ایک مخصوص گروپ کی وساطت ہی سے عمل میں آسکتا ہے۔ یہ گروپ باقی نوع انسانی پر اثر انداز ہوگا اور اس کی راہ نمائی کرے گا۔

اسی گروپ کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (۲/۱۴۳) اور اس ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنایا ہے تاکہ تم نوع انسان کے اعمال کی نگرانی کرسکو۔

وحی کی رُو سے بلند اقدار پر ایمان اس گروپ کے افراد کے خیالات اور تصورات میں ایسی ہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے جس سے ان میں کسی قسم کا اختلاف و افتراق باقی نہیں رہتا۔ اوسپنسکی کے الفاظ ہیں۔

## ہم آہنگی

انسانوں کو ایک دوسرے کے سمجھنے میں غلط فہمیاں اس لئے پیدا ہوجاتی ہیں کہ وہ مختلف جذبات کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں اگر ان کے جذبات میں ہم آہنگی پیدا ہوجائے تو وہ ایک دوسرے کو بالکل صحیح طور پر سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ (TERTIUM ORGANUM)

اسی حقیقت کو قرآن کریم نے فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا (۳/۱۰۳) کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ایمان کی نعمت ہے جس سے دلوں میں کامل ہم آہنگی پیدا ہوجاتی ہے اور اس طرح ایک ایسی برادری وجود میں آجاتی ہے جہاں لوگ اپنے خود ساختہ معیاروں کی جگہ خدا کے تجویز کردہ محکم معیار کے مطابق رشتۂ اخوت میں منسلک ہوجاتے ہیں۔ یہی رشتۂ اخوت ان میں باہمی تعاون کے جذبات کو بیدار کرتا ہے اور ان کی کیفیت یہ ہوجاتی ہے کہ

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۱۰۳/۳)

## حق و استقامت کی تلقین

وہ ایک دوسرے کو ہمیشہ حق اور استقلال کی تلقین کرتے رہتے ہیں، ایک فرد تنہا معاشرہ میں تبدیلی پیدا نہیں کرسکتا۔ اس کے لئے ان افراد کے گروہ میں شامل ہونا ضروری ہے جو یہی مقصد اپنے سامنے رکھتے ہوں۔ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (۹/۱۱۹) اور وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (۲/۴۳) اسی لئے قرآن کا ارشاد ہے بلکہ وہ اس سے بھی آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ جنت میں داخل ہونے کی شرط یہ ہے کہ تم خدا کے بندوں کے گروہ میں شامل ہوجاؤ۔ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ۔ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (۸۹/۲۹)۔ گرجیف اس باب میں لکھتا ہے۔

وہ شخص جو جاگنا چاہتا ہے اسے ایسے اشخاص تلاش کرنے چاہئیں جو اسی کی طرح جاگنا چاہتے ہیں اس گروہ کو پھر باہمی تعاون سے کام کرنا چاہئے۔

(BRIGHTMAN) ان کے متعلق لکھتا ہے۔

یہ معاشرہ ان آزاد لوگوں پر مشتمل ہوگا جو ایک معقول اور قابل قدر واحد نصب العین کے حصول کے لئے باہمی تعاون

دو عناصر سے کام ہیں۔ وہ نصب العین جس کی بنیادیں خدا کے ایمان پر استوار ہوں۔

(A PHILOSOPHY OF RELIGION)

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

"تواصوا بالحق" کی اہمیت کے لئے آپ اپنے موجودہ معاشرہ پر نگاہ ڈالئے۔ آج اگر کوئی شخص دیانتداری کی زندگی بسر کرنے کا ارادہ کرے تو ہر شخص اسے (DISCOURAGE) کرے گا۔ اگر وہ ملازمت پیشہ ہے تو اس سے کہا

**موجودہ حالت**

جائے گا کہ اس سے تم کبھی ترقی نہیں کر سکو گے۔ تنخواہ میں گذارا نہیں ہوگا۔ افسرانِ بالا کو خوش نہیں رکھ سکو گے تو وہ دشمن ہو جائیں گے۔ لوگوں میں (UN-POPULAR) ہو جاؤ گے۔ تمہارے ماتحت تمہارے ساتھ تعاون نہیں کریں گے اس لئے تم نالائق کہلاؤ گے۔ خواہ مخواہ بیٹھے بیٹھے تمہاری کیوں شامت آئی ہے۔ میاں! انسان کو ہمیشہ زمانے کے ساتھ چلنا چاہیئے۔ بڑے بوڑھے اسی لئے کہہ گئے ہیں کہ —— چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی —— اگر وہ "بزنس مین" ہے تو ہر شخص اس سے کہے گا کہ دیانتداری سے کاروبار نہیں چلا کرتے۔ ہم نے خود اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیا ہے۔ ہم کئی سال تک دیانتداری کی پالیسی پر عمل کرتے رہے اتنا نقصان اٹھایا کہ کوڑی تک پاس نہ رہی۔ بالآخر تنگ آ کر دنیا کی عام روش اختیار کرنی پڑی۔ اب اللہ کا فضل ہے۔ بات وہی ٹھیک ہے جو سعدی کہہ گیا ہے کہ —— زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز —— غرضیکہ اُس سے تعاون کرنا تو ایک طرف کوئی شخص اس کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کرے گا۔ قرآن کریم نے یہودیوں کے خلاف جو فردِ جرم مرتب کی تھی اس میں ایک شق یہ بھی تھی کہ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ (۵/۷۹) وہ ایک دوسرے کو بری باتوں سے جنہیں وہ عمل میں لاتے تھے روکتے نہیں تھے اس لئے ان کا معاشرہ تباہ و برباد ہو گیا۔ ہمارا معاشرہ تو اس سے بھی ایک قدم آگے چلا گیا ہے یعنی اس میں لوگوں کو دیانتدار بننے سے روکا جاتا ہے اور بددیانتی کی تلقین کی جاتی ہے۔ اس کے برعکس جماعت مومنین کا معاشرہ ہوتا ہے کہ اس میں ہر ایک، ایک دوسرے کو حق پر قائم رہنے کی تلقین کرتا اور اس کے لئے اس کا دست و بازو بنتا ہے۔

حق پر قائم رہنے میں یقیناً مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان مشکلات کو استقلال اور استقامت سے برداشت کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے قرآنی معاشرہ میں لوگ ایک دوسرے کو حق پر قائم رہنے کی ہی تلقین نہیں کرتے بلکہ اس کے ساتھ استقلال و استقامت

**استقامت**

کی بھی تاکید کرتے ہیں لیکن ان کی یہ تلقین محض زبانی وعظ و نصیحت نہیں ہوتی۔ وہ عملاً ایک دوسرے کی استقامت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا۔ اے جماعتِ مومنین، تم ہمیشہ استقامت سے کام لو۔ وَصَابِرُوْا۔ یہی نہیں کہ فرداً فرداً خود استقامت دکھاؤ بلکہ ایک دوسرے کی استقامت کا ذریعہ بن جاؤ۔ اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ وَرَابِطُوْا۔ ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر رہو۔ ہاتھوں میں باہیں ڈال کر اس طرح چلو کہ اگر کسی کا ایک پاؤں پھسلنے لگے تو دوسرے اسے گرنے سے بچا لیں۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ۔ یوں مل کر قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۳/۱۹۹)۔ یہی طریقِ زندگی ہے جس سے تم کامیاب ہو سکو گے۔

تواصوا بالصبر۔ کا عملی مفہوم یہ ہے کہ ان میں سے ہر فرد جہاں اپنی استقامت کے لئے انتہائی سعی و کاوش کرتا ہے وہاں دوسروں کے لئے موجب تقویت و استقامت بننے کے لئے بھی ہر وقت سرگرم عمل رہتا ہے۔ یہی وہ عظیم حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہکسلے (HUXLEY) نے کہا ہے کہ

> میرا خیال ہے کہ انسان کے تمام فرائض کو ان چند الفاظ میں سمٹایا جا سکتا ہے۔ بھرپور زندگی تمہارے اپنے لئے بھی اور تمہارے ہمسایہ کے لئے بھی۔ میرا خیال ہے کہ اگرچہ انسان پریشانیوں، تکلیفوں اور مصیبتوں میں گھرا ہوا ہے۔ با ایں ہمہ وہ اس فریضہ کو سرانجام دے سکتا ہے۔ اور اس طرح آہستہ آہستہ اپنی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ (RELIGION WITHOUT REVELATION)

اسی کو راشڈل ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ

> مثالی معاشرہ ایسی کیفیت کا نام ہے جس میں ہر فرد معاشرہ کی بہبود کے لئے وہی کچھ کرے جو معاشرہ اس فرد کی بہبود کے لئے کرتا ہے اور اس طرح ان "مقاصد کی مملکت" کا قیام عمل میں آجائے جو نوع انسان کے بلند ترین مقاصد ہیں۔ (THE THEORY OF GOOD AND EVIL VOL II)

وہ دوسرے مقام پر اس سے بھی واضح تر الفاظ میں کہتا ہے کہ مثالی معاشرہ میں حالت یہ ہونی چاہیئے کہ

> میں کسی دوسرے کی نشو و نما کی فکر کروں اور اس میں اپنا مفاد اور خیر سمجھوں۔ اور اسی طرح وہ میری نشو و نما کی فکر کرے اور اس میں اپنا مفاد اور خیر سمجھے۔ (VOL. II)

یہی وہ "تواصوا بالحق وتواصوا بالصبر" والوں کا مثالی معاشرہ ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ ان پر

**نزول ملائکہ**

فرشتوں کا نزول ہوتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا۔ وہ لوگ جو اس حقیقت کبریٰ پر یقین محکم رکھتے ہیں اور اس کا اعلان کرتے ہیں کہ ہمارا نشو و نما دینے والا صرف ایک خدا ہے اور اس کے قانون ربوبیت کے سوا ہم کسی اور کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ وہ اس صداقت پر ایمان رکھتے ہیں اور پھر اس ایمان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ۔ ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ وہ یہ کہتے ہوئے ان پر نازل ہوتے ہیں کہ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا۔ تم کسی قسم کا خوف نہ کھاؤ۔ قطعاً نہ گھبراؤ۔ وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ لو! اس جنتی زندگی کی خوشخبری لو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ تمہارے لئے ڈرنے کی کونسی بات ہے؟ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ۔ ہم تمہاری دنیاوی زندگی میں بھی تمہارے حامی اور مددگار ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ (۳۱)

اس میں تمہارے لئے وہ سب کچھ ہے جسے تم چاہو۔ وہ سب کچھ جسے تم مانگو۔ اس دنیا میں بھی اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی تم خدا کے مہمان ہو۔ وہ تمہارا میزبان ہے۔ اور تم جانتے ہو کہ میزبان کے ذمے، مہمان کی حفاظت اور تواضع سب لازم ہوتی ہے۔ اس لئے جو کچھ تمہیں دیا

جاتا ہے یہ سب نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ہے۔ یعنی خدائے غفور رحیم کی طرف سے سامانِ مہمان نوازی۔ (۴۱/۳۲)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جماعت کی حق و صداقت کے مطابق زندگی بسر کرنے اور اس پر استقامت سے جمے رہنے کا نتیجہ کیا یہی ہوتا ہے کہ اُس جماعت کو خوشگواریوں اور سرفرازیوں کی جنتی زندگی مل جاتی ہے۔ یا اس سے انسانیت کا بھی کچھ فائدہ ہوتا ہے؟

**بہبودِ انسانیت**

اس سوال کا مختصر الفاظ میں جواب یہ ہے کہ یہ سب کچھ انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی سب سے پہلی سورۃ کی سب سے پہلی آیت میں کہا گیا ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱/۱) اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا ستائش و ستائش اس لئے ہے کہ وہ کسی خاص خاندان۔ خاص قبیلہ۔ خاص گروہ۔ خاص جماعت۔ خاص ملک۔ خاص قوم کا نشوونما دینے والا نہیں۔ وہ عالمگیر انسانیت کی نشوونما کا ذمہ دار ہے۔ اور اس کتاب کی آخری سورۃ میں ہے کہ خدا رَبِّ النَّاسِ (۱۱۴/۱) یعنی تمام نوعِ انسانی کی پرورش کرنے والا ہے۔ اس لئے جو جماعت اس خدا کے نظام کے قیام کی ذمہ دار ہوگی، وہ عالمگیر انسانیت کی نشوونما کے مقصدِ عظیم کو اپنے سامنے رکھے گی۔ اس جماعت کا ایمان یہ ہے کہ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳) تمام نوعِ انسان ایک برادری ہے۔ اس لئے زندگی کی سطح اسی صورت میں بلند ہو سکتی ہے جب تمام انسانیت (HUMANITY) کی سطح بلند ہو۔ ایسا نظام جس میں صرف کسی مخصوص گروہ کا ارتقاء ہو، عام انسانیت کا ارتقاء نہ ہو، کبھی باقی نہیں رہ سکتا۔ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (۱۳/۱۷) صفحۂ ارض پر بقاء دوام اسی کے لئے ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے نفع بخش ہو۔ مشہور روسی مفکر اوسپنسکی اس باب میں لکھتا ہے۔

> اگر نوعِ انسان کا ارتقاء نہیں ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حیاتِ نامی کا ارتقاء رک جائے گا۔ اور اس طرح کائنات میں تخلیقی شعاع کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ اگر انسانیت کا ارتقاء نہ ہو تو اس مقصد کے پیشِ نظر جس کے لئے انسان کی تخلیق ہوئی تھی، ایسی انسانیت بے کار ہو جاتی ہے۔ اور بیکار ہونے کا مطلب اس کی فنا ہے۔ اس طرح سلسلۂ ارتقاء کے رک جانے کا مفہوم انسانیت کی فنا ہوگا۔
>
> (IN SEARCH OF THE MIRACULOUS)

قرآن کریم اس حقیقت کو بڑے دلنشیں پیرایہ میں ذہن نشین کراتا ہے جب کہتا ہے کہ یاد رکھو مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (۳۱/۲۸) تمام نوعِ انسان کی تخلیق اور بعثت، ایک نفس کی طرح ہے۔ تمہارا پیدا کرنا اور اٹھانا بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی ایک متنفس کا پیدا کرنا اور اٹھانا۔ تم میں سے ایک فرد کی قیمت پوری نوعِ انسانی کی قیمت کے برابر ہے۔ اس لئے مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (۵/۳۲) جس نے کسی ایک جان کو بھی ناحق قتل کر دیا اس نے گویا تمام نوعِ انسان کو قتل کر دیا۔ اور جس نے کسی ایک جان کے لئے سامانِ زندگی بہم پہنچا دیا اس نے گویا تمام نوعِ انسان کو زندگی بخش دی۔

**کانٹ کا نظریہ**

مغربی مفکرین میں کانٹ کا مقام بہت بلند سمجھا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اخلاق کا اصل

الاصول یہ ہے کہ

اس طرح کام کرو گویا تم اور تمام افراد انسانیت، ذاتی قیمت کے اعتبار سے برابر ہو۔ تم ایک ایسے معاشرے کے فرد بن جاؤ جس میں ہر فرد، دوسرے فرد کے مفاد کی قیمت اپنے مفاد کے برابر سمجھتا ہے۔

(THE CATEGORICAL IMPERATIVE)

کانٹ کی نگاہ زیادہ سے زیادہ یہیں تک جا سکی کہ ایک مثالی معاشرہ میں ہر فرد، دوسرے فرد کی مفاد کی قیمت اپنے مفاد کے برابر سمجھتا ہے۔ لیکن قرآن کریم اس سے بھی آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ قرآنی معاشرہ وہ ہے جس میں یُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹:۹) ہر فرد دوسرے فرد کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دیتا ہے خواہ اس سے اسے خود تنگی میں ہی کیوں نہ رہنا پڑے۔

یہ وہی انسان ہے جو زندگی کی بلند اقدار پر ایمان نہ رکھنے سے ہر وقت اس فکر میں رہتا ہے کہ کس طرح دوسروں کا سب کچھ لوٹ کھسوٹ کر اپنا گھر بھر لے۔ انسان اگر وحی کی روشنی کے بغیر چلے تو زندگی کی پست ترین سطح پر پہنچ جاتا ہے لیکن اگر اسے اس کی راہ نمائی کے لئے یہ قندیل حالتاب میسر آجائے تو وہ اقطار السمٰوٰت والارض سے بھی آگے چلا جاتا ہے۔

## انسان کی پستی اور بلندی

برنلنے اسی تضاد کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

ایک طرف انسان ایک اخلاقی حیوان ہے۔ وہ مقاصد کی تخلیق کرتا ہے۔ وہ ولی بن جاتا ہے۔ مرتبہ شہادت حاصل کر لیتا ہے۔ بطل عظیم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

لیکن دوسری طرف یہی انسان تمام حیوانات میں پست ترین سطح پر پہنچ جاتا ہے۔

ایک طرف یہ بلند نصب العین کی خاطر اپنی جان تک دے دیتا ہے۔ اور دوسری طرف یہ ایک بچے کو دھوکا دینے سے بھی نہیں چوکتا۔ (PSYCHE'S LAMP. P. 206)[۱]

لیکن کامیابیاں اور کامرانیاں انہی انسانوں کے لئے ہیں جو بلند نصب العین کی خاطر جینا اور اسی کی خاطر مرنا جانتے ہیں۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ (۲۳:۱) یہ وہ حقیقت کبریٰ ہے جس پر انسانیت کی پوری تاریخ شاہد ہے۔

وَالْعَصْرِ ۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۔ (۱۰۳:۱-۳)

زمانہ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ انسان جب وحی کی روشنی کے بغیر چلتا ہے تو ہمیشہ نقصان اٹھاتا ہے اس نقصان سے وہی لوگ محفوظ رہ سکتے ہیں جو زندگی کی بلند اقدار پر یقین محکم رکھیں اور صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں۔ وہ ایک دوسرے کو حق کی تلقین کریں اور

۱۔ اس تقریر میں اس اقتباس کے علاوہ اور سب اقتباسات "انسان نے کیا سوچا؟" سے لئے گئے ہیں۔

اس راہ میں آنے والی مشکلات کا استقلال و استقامت سے مقابلہ کرنے کی تاکید کریں۔ اس امر کا فیصلہ کرنا ہر دور کے انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے کہ وہ بدستور تباہیوں اور بربادیوں کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے یا فوز و فلاح کی راہ اختیار کرنا۔ عصرِ حاضر کے انسان کے لئے بھی سب سے پہلے اسی بنیادی نقطہ کا فیصلہ کرنا ضروری ہے۔ برگساں کے الفاظ میں

> آج نوعِ انسان، خود اپنی ترقی کے بوجھ کے نیچے دبی، کچلی مصروفِ آہ و فغاں ہے۔ یہ اس لئے کہ انسان کو اس کا احساس نہیں کہ اس کا مستقبل خود اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلے اس کا فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ انسان زندہ رہنا چاہتا ہے یا نہیں۔ پھر اس کے بعد یہ کہ انسان محض زندہ رہنا چاہتا ہے یا اس سے آگے بڑھ کر فریضۂ کائنات کی تکمیل کے لئے بھی جد و جہد کرنے کو تیار ہے۔ فریضۂ کائنات کیا ہے؟ اُن ہستیوں کا پیدا کرنا جو صفاتِ خداوندی کی مظہر ہوں۔
>
> THE TWO SOURCES OF MORALITY AND RELIGION

انسانیت زندگی کے دوراہے پر کھڑی، عصرِ حاضر کے انسان کے اس فیصلہ کے انتظار میں ہے کہ وہ بدستور نفیٔ خُسر رہنا چاہتا ہے یا حَسَمُ الْمُفْلِحُوْنَ کے زمرہ میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ یہ اپنے لئے جس قسم کا فیصلہ کرے گا، قرآن کی بارگاہ سے اس کے لئے اسی قسم کا فتویٰ صادر ہو جائے گا۔ اس لئے کہ عدالتِ خداوندی سے موت و حیات کے فیصلے اندھا دُھند صادر نہیں ہوتے۔ دلائل و براہین کی رُو سے ہوتے ہیں۔ وہاں کا اصول یہ ہے کہ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ۔ (الانعام) جسے ہلاک ہونا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے زندہ رہے۔

دیکھیں زمانہ کی اس بے لاگ شہادت سے کون فائدہ اُٹھاتا ہے؟

---

## خریداران طلوع اسلام کی اطلاع کیلئے

ایک بار پھر یہ واضح کیا جاتا ہے کہ حتی الامکان ہر ماہ کی آخری تاریخ کو طلوع اسلام کا آئندہ شمارہ حوالۂ ڈاک کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پرچہ نہ ملنے کی صورت میں خریداران کی طرف سے متعلقہ مہینے کی دس تاریخ (یا زیادہ سے زیادہ پندرہ تاریخ) تک دفتر میں اطلاع پہنچنی ضروری ہے۔ اس صورت میں (بشرطیکہ فالتو پرچہ دفتر میں موجود ہو) پرچہ بلا قیمت ارسال کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ لیکن اس سے تاخیر کے بعد اطلاع ملنے پر مطلوبہ پرچہ بلا قیمت نہیں بھیجا جا سکے گا۔

از راہ کرم خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ لازماً دیجئے۔

ناظم
ادارہ طلوع اسلام

# لُغاتُ القرآن

(جلد اوّل اور جلد دوم)

جس کا برسوں سے انتظار تھا

## قرآنی معارف و مطالب کا بصیرت افروز انسائیکلوپیڈیا

سالہا سال کی دیدہ ریزیوں اور تفہیمی کاوشوں کا جگمگاتا ہوا شاہکار!

## قرآن کے الفاظ ــــ قرآن کے تصوّرات ــــ قرآن کی تعلیم

کتاب کے حصہ اول میں عربی زبان کے مبادیات اور مفردات بھی شامل ہیں جن کی بدولت عربی زبان سے ناآشنا حضرات بھی قرآنی مفہوم و مطالب سے بخوبی مستفید ہو سکیں گے۔

جن احباب نے یہ علم افروز کتاب حاصل نہیں کی وہ اسے جلد حاصل کر لیں۔ کیونکہ ایسی نادر کتب بار بار طبع نہیں ہوتیں

ٹائپ کی حسین و دلاویز طباعت۔ بہترین سفید کاغذ۔ پائیدار ستھری اور دیدہ زیب جلد

قیمت جلد اول:۔ **پندرہ روپے** (علاوہ محصولڈاک)

قیمت جلد دوم:۔ **پندرہ روپے** ( 〃 〃 〃 )

ملنے کا پتہ:۔ **مکتبہ طلوعِ اسلام** ۔ ۲۷۔ بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

(مسلسل)

# قائد اعظم

(۳)

## تحریکِ پاکستان کے پس منظر میں

### ترکشِ ما را خدنگِ آخریں

(محترم صفدر سلیمی صاحب)

حیاتِ قائد کے سلسلۂ تفاصیل میں ہم اس وقت جو کچھ لکھ چکے ہیں اس سے قائد اعظم کے وہ کارہائے نمایاں سامنے آچکے ہیں جو انھوں نے ۱۹۳۰ء تک مسلسل پچیس برس برطانوی امپیریلزم کے خلاف ملک کی تحریکِ آزادی کے کارزار میں سرانجام دیئے۔ ازاں بعد ان کے تاریخی اعلانات و بیانات کی روشنی میں ملتِ اسلامیہ کی آرزوؤں اور امنگوں کا وہ منتہاء و مقصود بھی منظرِ اشاعت پر آچکا ہے جو تحریکِ پاکستان کی شکل میں اس ملک کی تاریخ میں انقلابِ عظیم کا حرفِ آغاز ثابت ہوا۔ قومی زندگی کی ان حسین امنگوں نے چند ہی سالوں میں ہماری ملت کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو ایک سیسہ پلائی دیوار کی صورت عطا کر دی۔ انہی آرزوؤں کے جذبِ دروں کی قوت سے ہم مشکلات و موانعات کے پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کرنے کے قابل ہو گئے۔ اسی لیلائے مقصود کی چشمکِ ناز نے ہمارے اجتماعی شعور کو حیاتِ تازہ کی تڑپ اور خلش سے مالا مال کیا۔ جذب و مستی کے یہی والہانہ عزائم ارضِ پاکستان کے حصول پر منتج ہوئے۔ نشأۃ ثانیہ کے یہی بے تاب ولولے تھے جنہوں نے آخر ایک دن ہمیں آزاد قوموں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ یہ درست ہے کہ ہماری قومی زندگی کی یہ حسین ترین امنگیں ابھی بتمام و کمال حاصلِ مراد کو نہیں پہنچیں۔ لاریب کہ ارضِ پاک میں ابھی قرآنی نظام کی وہ بساط نہیں بچھی جس کی خوش گواریاں جنتِ ارضی کا سماں باندھتی ہیں۔ بے شک ابھی اس طرح بہار نے یہاں اپنے چہرے سے نقاب

نہیں اُٹھا جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ملت سالہا سال سے وقفِ انتظار چلی آ رہی ہے۔ یہ سب کچھ بجا اور درست لیکن ساتھ ہی اس حقیقت کو نہ بھولیے کہ ان حسرتوں اور ارمانوں کا تعلق اب قائداعظم کی ذاتِ گرامی سے نہیں بلکہ یہ سب کچھ ملت کی ذمہ داریوں اور فرض شناسیوں سے وابستہ ہے۔ اور ہم یہاں ملت کی ذمہ داریوں کا تذکرہ نہیں چھیڑ رہے بلکہ ملت کے قائداعظم کی سیاسی تگ و تاز کی داستانِ جمیل بیان کر رہے ہیں اس لئے اب ہمیں اس وضاحت سے آگے بڑھ کر براہِ راست اس مقام پر آ جانا چاہیئے جہاں سے اس انقلاب انگیز اور محشر خیز تگ و تاز نے تحریکِ استخلاصِ ہند سے تحریکِ استقلالِ پاکستان کا رُخ اختیار کیا۔ ہمارا یہ موضوع قائداعظم کی زندگی کے اس دَور کی تفصیل پیش کرتا ہے جب وہ سنہ ۱۹۳۴ء میں انگلستان سے ایک نئے پیشِ نہاد کا عزم لے کر واپس لوٹے اور ان کی سیاسی جدّوجہد کا ہر گوشہ تنظیمِ ملت کے تقاضوں پر مرکوز ہو گیا اور مارچ سنہ ۱۹۴۰ء تک جب کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے لاہور سیشن میں قراردادِ پاکستان پہلی بار دنیا کے سامنے آئی۔ وہ اپنے کاروانِ ملت کو برابر ایک زندہ قوم کی صلاحیتوں سے بہرہ ور کرتے چلے گئے۔

## زندگی کا عبوری دور

قائداعظم ایسے عظیم اور مسلّمہ سیاست دان کا سنہ ۱۹۰۶ء سے سنہ ۱۹۳۰ء تک مسلسل اور پیہم پورے ہندوستان کی آزادی کے لئے صفِ اوّل میں سرگرمِ پیکار رہنا اور پچیس سال کی اس طویل مدت میں ہندو مسلم اتحاد کے کم و بیش تمام تاریخی اجتماعات میں اس کی اہمیت شمعِ محفل کی طرح واضح رہی تحریکِ پاکستان کی نئی اور قطعی طور پر مختلف منزل کا رُخ اختیار کرنا متحدہ ہندوستان کی تاریخِ سیاسیات کا ایک اہم واقعہ ہے لیکن اس واقعہ کا پس منظر شہادت دے گا کہ اس قدر عظیم قائد کی زندگی کا یہ اہم ترین موڑ نہ تو بچوں کا سا کوئی کھیل تھا اور نہ ہی جذباتی ترنگ کی کوئی ہنگامی روش۔ ہندو کانگریس کا مہاسبھائی ذہن ملکی آزادی کی جان توڑ کوششوں کو گنگا کے دھارے میں جس طرح ڈبوئے چلا جا رہا تھا اٹل حقائق اور تلخ تجربات کی روشنی میں اس کا انجام اس کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا جو قائداعظم کی سیاسی زندگی کے اس انقلاب کی صورت میں سامنے آیا اور حالات نے ثابت کر دیا کہ قائداعظم کا یہ نیا موڑ پوری ملت کی اجتماعی جدوجہد کا موڑ قرار پا گیا۔

سنہ ۱۹۳۰ء سے سنہ ۱۹۳۴ء تک قائداعظم کی عملی انداز زندگی ملکی سیاسیات سے دامن کشاں نظر آتی ہے۔ یہ دَور ان کی زندگی کا "عبوری دَور" ہے۔ صفِ اوّل کے اس عظیم قافلہ سالار کو ہم اس مدت میں ہر میدان سے غائب پاتے ہیں اور اگر اس کا کہیں سراغ ملتا ہے تو لندن کے ایک پُرسکون گوشے میں جہاں مایوسیوں کی تاریکیاں ہیں وہ اس روشنی کا متلاشی ہے جو زندگی کی حقیقی منزل کی نشان دہی کر سکے۔ ہم قائداعظم کی اپنی زبانی ان کی اس کیفیت کا نقشہ پیش کر چکے ہیں۔ اور ہمیں یہ بھی بتا چکے ہیں کہ روشنی کی یہ ننھی کرن بالآخر جلوہ بار ہوئی اور انہوں نے اس منزل کو پا لیا جو ذلّت زدہ مسلمانوں کے عروج و اقبال، ان کی آزادی و استقلال اور نشاۃِ ثانیہ کی امین ثابت ہوئی۔ اور اس نے نہ صرف ہندو راج کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا بلکہ اس برصغیر کی پوری تاریخ کو بدل کر رکھ دیا۔

۱۹۳۳ء میں وہ مایوسی اور شکست کے اس مقام پہ کھڑے تھے جہاں نہ کوئی منزل سامنے تھی اور نہ نشان منزل۔ ان کی زندگی سربسر ایک طلسم پیچ وتاب بن رہی تھی کہ ایک جہاں تاب روشنی نے نئی منزل کو ان کی نگاہوں کے سامنے واشگاف کر دیا۔

## تنظیم ملت کا نیا مرحلہ

۱۹۳۵ء سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا اعلان اور اس کے تحت صوبجاتی خود مختاری (PROVINCIAL AUTONOMY) کا نفاذ حکومت برطانیہ کا وہ نیا اقدام تھا جس کے تقاضے قائداعظم کو کشاں کشاں لنڈن سے واپس لے آئے۔ ان کی عقابی نگاہیں ان آئینی اصلاحات کے نتائج وعواقب کو اپنی نگاہوں کے سامنے صاف اور واشگاف طور پر دیکھ رہی تھیں۔ انہیں واضح طور پر نظر آرہا تھا کہ اپنے منظم وسائل کے زور پر کانگرس کیا کچھ کر گذرے گی اور صوبائی حکومتوں پر مسلط ہو جانے کے بعد وہ ملت اسلامیہ کے مستقبل کو کن خطرات سے دو چار کر دے گی۔

انگلستان سے واپس پہنچتے ہی وہ خطرے کا بگل بجا دیتے ہیں اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے کروڑ مسلمانوں کو منظم ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس دعوت کو لبیک کہتے ہوئے مسلمان ابھی تنظیم کے ابتدائی مرحلے طے کر رہے تھے کہ اواخر ۱۹۳۶ء میں صوبائی انتخابات کا کٹھن مرحلہ سامنے آگیا نتیجۃً کانگرس سات ہندو اکثریت کے صوبوں پر مسلط ہو گئی۔ اور ۱۹۳۷ء کا آغاز ان صوبوں کے مسلمانوں کے لئے ہیجان واضطراب اور خطرات کے طوفان لئے نمودار ہوا۔

## تحریک پاکستان کا پس منظر

۱۹۳۷ء سے اسلامیان ہند کی قومی بیداری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے یہی تھا سیاسیات ہند کا وہ نازک مرحلہ جہاں سے قائداعظم کی جولانیاں ایک انقلاب نو کا علم لئے آگے بڑھتی ہیں۔ کل کا "پیامبر اتحاد" اب صرف اپنی ملت کا "قائداعظم" بن کر ملت کے سفینۂ حیات کی ناخدائی کے لئے میدان میں نمودار ہوتا ہے۔ بیک وقت دو محاذ اس کے سامنے آتے ہیں ایک طرف برٹش امپیریلزم کی پرجلال قوت اور دوسری جانب وہ منظم اور برسر اقتدار کانگرس جس کی پشت پہ ٹاٹا اور برلا کے خزانے تھے۔ وہ دونوں قوتوں کے چیلنج کو مردانہ وار قبول کرتا ہے اور دو مکھی جنگ لڑتا ہوا دونوں کے ہاتھ بل دیوانہ وار ڈٹ جاتا ہے۔

آئین جوانمرداں حق گوئی و بے باکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

قائداعظم اپنی ملت کی پاسبانی کے لئے آگے بڑھتے ہیں —— یہ ملت مدت سے ریت کے ذروں کی طرح پریشان تند و تیز تصادموں کی زد میں چلی آ رہی تھی لیکن اب وہ از سر نو ایک پیکر کوہ کی صورت میں ڈھلنے کے لئے بیتاب تھی۔ اس نازک مرحلے پر انہیں محمد علی جناح جیسے قائد جلیل کی قیادت نصیب ہوئی۔ اور یہ حقیقت نکھر کر منظر عام پہ آ گئی

اور وہ پوری کامیابی سے دشمنوں کے حملوں کو پسپا کرتے اور اس کی سیاسی مہربازیوں کو مات دیتے ملّت کو لے کر بحفاظت تمام فتح و ظفر کی منزلِ مقصود تک پہنچ گئے۔

اشاعتِ زیرِ نظر میں ہم اس سیاسی آویزش کے سلسلہ وار ذیل میں سے قائداعظم کے مارچ ۱۹۴۰ء تک کے کارناموں کی داستان پیش کر رہے ہیں کیونکہ مارچ ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان ایک واضح نشانِ منزل بن کر سامنے آ گئی تھی اور اس مقام سے ایک نئے باب کا آغاز ہوا تھا۔ یہ اہم باب آئندہ اشاعت میں "تحریکِ پاکستان" کے عنوان سے سامنے لایا جائے گا۔ مارچ ۱۹۴۰ء تک کے واقعات پر مشتمل زیرِ نظر اشاعت تنظیمِ ملّت کے ابتدائی دور کا نقشہ بھی پیش کرے گی اور تحریکِ پاکستان کا پس منظر بھی۔

سات صوبوں کی وزارتوں پر اپنا تسلط قائم کرتے ہی کانگرس نشۂ پندار کی بدمستی میں کھو گئی اور اس کے نافوس خصوصی پنڈت جواہر لال نہرو نے اسی نشے میں اعلان کیا کہ ہندوستان میں دو ہی طاقتیں ہیں۔ انگریز اور کانگرس۔ پنڈت جی کا یہ اعلان واضح طور پر مسلم لیگ اور مسلمانوں کی ابھرتی ہوئی قوتِ تنظیم کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا اور یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ قائداعظم جیسا بے باک اور عظیم مدبر اس چیلنج کو خاموشی سے گوارا کر لیتا۔ کانگرس کے لامحدود وسائل، بے پناہ قوتِ تنظیم اور بالخصوص سات صوبوں کی وزارتوں پر اس کا قبضہ۔ ان سب کے مقابلے میں قائداعظم اور اس کے کاروانِ شوق کی بے سروسامانی لیکن

وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

ملّتِ اسلامیہ کی غیرت کا امین مردانہ وار آگے بڑھا اور ملک کی سیاسی فضا میں اس کی یہ لرزہ فگن گرج سنائی دی۔

یہاں ایک تیسری طاقت بھی موجود ہے اور وہ ہے نو کروڑ مسلمانوں کی طاقت۔ اسے نہ انگریز نظرانداز کر سکتا ہے اور نہ کانگرس۔

اور اس کے تھوڑی ہی مدت بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ (۱۹۳۷ء) میں واقعی دنیا نے اس تیسری طاقت کو جاہ و جلال کے محسوس و مشہود پیکروں میں جلوہ نما دیکھ لیا۔ لکھنؤ کا یہ بے مثال قومی اجتماع سیاستِ ہند میں ایک نئی صبح کا عنوان تھا۔ پنجاب، بنگال اور آسام کے وزرائے اعظم اس قومی دربار میں مسلم لیگ سے عہدِ وفا استوار کرنے کے لئے حاضر ہوئے۔ اور یہ واضح ہو گیا کہ اسلامی ہند کی وہ تمام قوتیں جو صدیوں سے زوال اور شکست سے دوچار چلی آ رہی تھیں اب ایک بے مثال اجتماعی شعور سے مالا مال ہو کر حیاتِ تازہ کی بازآفرینیوں کے لئے تڑپ رہی ہیں۔

**مجاہدانہ للکار**

ملّتِ اسلامیہ کا یہی وہ تاریخی اجتماع تھا جس میں ملّتِ اسلامیہ نے پہلی بار انگریز اور کانگرس کے

مقابلہ میں اپنے قومی تحفظ کے بلند بانگ ارادوں کا اعلان کیا۔ اس اجلاس میں قائداعظم کا خطبہ صدارت تاریخی اہمیت کا حامل تھا۔ چنانچہ ان کی مجاہدانہ للکار بانگ رحیل بن کر گونجی اور کانگریسی وزارتوں کے گھناؤنے کردار سے نقاب اُلٹتے ہوئے انہوں نے اعلان کیا کہ

> کانگریس نے اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کے لئے ہے۔ اس نے نام نہاد نیشنلزم کا سوانگ بھر رکھا ہے۔ اور میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ کانگریس پارٹی کی موجودہ پالیسی جماعتی عناد اور فرقہ وارانہ مناقشت پیدا کر کے ملوکانہ تسلط کے استبقاء کا باعث ہوگی۔
>
> (خطبہ صدارت اجلاس لکھنؤ۔ از قائداعظم)

اور اس کے بعد ملت کے سامنے اس کی منزل کی نشان دہی کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

> مسلمان اگر اپنی کھوئی ہوئی قوتوں کو از سر نو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس وقت صرف ایک ہی چیز انہیں یہ سہارا مہیا کر سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے کھوئے ہوئے یقین کو دوبارہ حاصل کریں اور اسی محکم اور بلند تصور کا سہارا لے کر اٹھیں جو ان کی عالمگیر قومی وحدت کا جزو لاینفک ہے اور جو ان کو ایک سیاسی وحدت میں منسلک کرنے کا باعث ثابت ہوگا۔ مسلمانوں کے خلاف اغیار کی فرقہ پرستی اور رجعت پسندی کے طعن آمیز نعرے سن کر آپ کو گھبرانا نہیں چاہیئے۔ دنیا کا بدترین رجعت پسند اور شریر ترین فرقہ پرست جب کانگریس کے سامنے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال کر اپنی قوم کو گالیاں دیتا ہے تو اگلے روز وہی سب سے بڑا نیشنلسٹ قرار پا جاتا ہے۔ (ایضاً)

فروری ۱۹۳۸ء میں انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

> کانگریس نے ہمارے نوجوانوں کے دل و دماغ کو زہر آلود کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور انہیں ایسے سبز باغ دکھائے ہیں کہ وہ یہ سمجھنے لگ گئے ہیں کہ کانگریس واقعی آزادی کامل کی علمبردار ہے لیکن درحقیقت کانگریس کا مقصد کیا ہے؟ وہ حکومت برطانیہ سے بعض عہد و پیمان حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور جب اس میں کامیابی ہوئی تو اب وہ اسی دستور سے نہ صرف مستفید ہو رہے ہیں بلکہ اس پر پوری طرح عمل پیرا ہیں۔ جسے تباہ کرنے کا بڑے شد و مد سے دعویٰ کیا تھا۔

انہوں نے اس خطاب میں مزید یہ واضح کیا کہ:

> مسلم لیگ نے بڑی حد تک مسلمانوں کو برطانوی سامراج کے پنجہ سے نجات دلا دی ہے لیکن اب ایک نئی طاقت سامنے آئی ہے جس کا دعویٰ ہے کہ وہ حکومت برطانیہ کی جانشین ہے۔ آپ اسے جس نام سے چاہیں پکار لیں لیکن وہ اصل میں صرف ہندو اور ہندو راج ہے۔

اب ملکی سیاسیات ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکی تھیں۔ کانگریس صوبائی اقتدار کے نشے میں مہا سبھائی ذہن کی کرشمہ سازیوں کو بروئے کار لا رہی تھی اور دوسری طرف ان مظالم نے اسلامیانِ ہند کے سیاسی شعور اور احساسِ خودی کو اُبھارا اور وہ فوج در فوج مسلم لیگ کے پرچم تلے منظم ہونے شروع ہو گئے۔ کانگریسی اقتدار ملت کے لئے خطرے کا بگل ثابت ہوا۔

ع۔ تو نے وہ ٹھوکر لگائی کہ چشمِ ملت کھل گئی

## دوسری عالمگیر جنگ

یہی اس وقت جب کہ ملکی سیاسیات میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ ۳ ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء کو دوسری عالمگیر جنگ کے شعلے یک بیک بھڑک اُٹھے۔ برطانوی سامراج کے سامنے موت و حیات کی کش مکش کا ایک کڑا اور نازک ترین مرحلہ نمودار ہوا اور اس نے ضروری سمجھا کہ اس خطرناک آزمائش میں ملک کے ممتاز رہنماؤں سے مذاکرات کا سلسلہ قائم کر کے ہندوستان کی رائے عامہ کو ہموار بنایا جائے۔

گاندھی جی کے ساتھ وائسرائے بہادر نے قائداعظم کو بھی ملاقات کی دعوت دی۔ اس مذاکرہ کے بعد قائداعظم نے مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کیا اور ۱۸ ستمبر کے اجلاس میں جو اہم قرارداد منظور کی اس میں یہ واضح کیا گیا کہ:

## نشانِ منزل

۴۔ مجلس عاملہ اس بات کو واضح کرنا چاہتی ہے کہ مسلمانانِ ہند، ہندوستان کی سیاست میں ایک خاص اور نرالی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور بیسیوں برس سے وہ اس جد و جہد میں مصروف ہیں کہ ملک کی قومی زندگی، حکومت اور انتظامی امور میں ان کو عزت اور وقار کا مقام حاصل ہو تاکہ مسلمان اپنے سیاسی، اقتصادی، کلچرل اور جماعتی حقوق و مفاد کے تحفظ کی ضمانت کے ساتھ اکثریت کے دوش بدوش مساوی طور پر سرگرم عمل ہوں۔

قرارداد کے پچھلے حصے میں کہا گیا۔

تمام اسلامی ہندوستان، ہندوستان کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف صف آرا ہے اور بار بار اس نے آزاد ہندوستان کی تائید میں اعلان کیا ہے مگر وہ انتہائی مخالف اس کا ہے کہ مسلمانوں یا دیگر اقلیتوں پر ہندو راج کا استبداد قائم ہو اور اسلامی ہند کو غلام بنایا جائے۔

قرارداد کے آخر میں کہا گیا:

اگر حکومت برطانیہ اس نازک، عالمگیر اور شدید خطرہ میں مسلمانانِ ہند کا پورا، مؤثر اور باعزت اشتراک عمل چاہتی ہے اور اس کی یہ خواہش ہے کہ یہ کامیابی سے ختم ہو تو اسے چاہئے کہ مسلمانانِ ہند میں سلامتی اور اطمینان کا احساس پیدا کرے اور آل انڈیا مسلم لیگ کا اعتماد حاصل کرے کیونکہ اسلامیانِ ہند کی نمائندگی کی مجاز یہی انجمن ہے۔

مجلس عاملہ مسلمانوں سے اپیل کرتی ہے کہ اس مشکل اور نازک وقت میں اتحاد و عزم راسخ کے ساتھ مسلم لیگ

کے جھنڈے تلے جمع رہیں تو نو کروڑ مسلمانوں کی عزت، وقار اور مستقبل کے لئے جس قربانی کی ضرورت ہو اس سے دریغ نہیں کریں گے۔ (جنگ۔ مسئلہ دستور ہند۔ از نوابزادہ لیاقت علی خاں)

۲۸ ستمبر کو قائداعظم نے عثمانیہ یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سالانہ ڈنر میں شرکت فرمائی اور اس یادگار موقع پر خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

میں ہمیشہ سے اس کا قائل ہوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان معاہدہ طے ہو لیکن یہ معاہدہ قابل احترام ہونا چاہئے۔ ایسا نہیں جس کا مقصد یہ ہو کہ ایک تباہ ہو جائے اور دوسرا بچے اور پروان چڑھے۔ ہماری بدنصیبی سے کانگریس کا اقتدار اعلیٰ اس کے لئے تیار نہیں۔ کہ دوستی کے ہاتھ کو تھامے بلکہ وہ اس ہاتھ کو مٹانے کے درپے ہے جو دوستی کے لئے بڑھایا جائے۔ اس وقت کسی کو روشنی نظر نہیں آ رہی لیکن آپ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ یہ دونوں قومیں کب متحد ہو جائیں گی۔ ہمارے سامنے جرمنی اور سوویٹ روس کی تازہ مثال موجود ہے۔ یہ دونوں قومیں بدترین دشمن تھیں مگر ان کے درمیان معاہدہ ہو گیا۔

میں مسلمانوں سے کہوں گا کہ اسلام آپ میں سے ہر ایک سے، اور مجموعی طور پر آپ سے، یہ توقع رکھتا ہے کہ اپنا فریضہ سرانجام دیں اور اپنی ملت کی حمایت میں اس طرح جذباتاً مخصوص بن کر کھڑے ہو جائیں گویا سب ایک نفس ہیں۔ (مسئلہ دستور ہند)

**بانگ رحیل**

علی گڑھ یونیورسٹی یونین کی فرمائش پر انہوں نے ملک کے مسلم نوجوانوں کے نام ایک پیغام میں تحریر فرمایا:

مسلم لیگ ہندوستان کی کامل آزادی کی طالب ہے۔ ایسی آزادی جو کسی ایک فرقہ کے لئے نہیں بلکہ ان سب قوموں کے لئے ہو جو اس برصغیر میں آباد ہیں۔ مسلم لیگ داعی ہے ایک آزاد اور خودمختار اسلام کی۔ اور اسلام ہر مسلمان سے توقع کرتا ہے کہ اس کے لئے اپنا فرض ادا کرے۔ تاریخ کے اس نازک دور میں وہ مقام اور منصب حاصل کرنے کے لئے جو مسلمانوں کی روایات اور ماضی کے ورثہ کے شایان شان ہو جس قدر بھی عظیم قربانیاں کی جائیں کم ہیں۔ اور بالخصوص اس وقت جب کہ ایک یورپ کی جنگ اور خطرناک ترین صورت حال درپیش ہے جس سے یقیناً دنیا کا عالم بدل جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کے مسلم نوجوان جن پر قومی ذمہ داریوں کا بار پڑنے والا ہے نو کروڑ اسلامیان ہند کے مستقبل کی تعمیر میں مدد کرنے سے قاصر نہیں رہیں گے۔ (ایضاً)

مسلم لیگ اب قائداعظم کی قیادت میں نو کروڑ مسلمانوں کی واحد نمائندہ تنظیم کا منصب حاصل کر چکی تھی۔ وائسرائے کے سرکاری مذاکرات میں قائداعظم کو صدر کانگریس اور گاندھی جی کے برابر مقام حاصل ہو چکا تھا۔ اور ان کی مضبوط قیادت

میں مسلمانوں کے خلاف کانگریس کے تمام منصوبے خاک میں مل رہے تھے۔ اس صورتِ حال نے کانگریسی رہنماؤں کو آپے سے باہر کر دیا۔ گاندھی جی جیسا ذمہ دار اور سرآز مودہ کار رہنما تلملا اٹھا اور "ہریجن" میں ایک مقالہ سپردِ قلم کرتے ہوئے انھوں نے قائد اعظم پر الزام لگایا کہ

## کذب وافترا

مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے جناح صاحب کی اُمیدیں دولتِ برطانیہ سے وابستہ ہیں کوئی چیز جو کانگریس کرے اور دے انہیں مطمئن نہیں کر سکتی۔

۵ر نومبر ۱۹۳۹ء کے اخبارات میں قائد اعظم نے اس الزام کا جواب دیتے ہوئے ایک بیان میں کہا:

> یہ قطعی افترا اور اسلامیانِ ہند کی توہین ہے جس کا مسٹر گاندھی جیسے مرتبے کے شخص کو مرتکب نہیں ہونا چاہئے تھا۔

## جواب آں غزل

اور پھر انھوں نے واضح فرمایا:

> میں مسٹر گاندھی کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمانانِ ہند اپنی اور صرف اپنی طاقت پہ بھروسہ کئے ہوئے ہیں۔ ہم نے اپنے ان حقوق و مفادات کے لئے کانگریس اور برطانیہ دونوں کے علی الرغم آخری خندق تک جنگ لڑنے کا عزم کر لیا ہے اور کسی دوسرے پہ تکیہ کرنا نہیں چاہتے۔
>
> (جنگ ـــ مسئلہ دستور ہند)

## اپنے آئینے میں

خود فریبی کا یہ کیسا عجیب و غریب مرحلہ ہے کہ قائد اعظم پہ برطانیہ پرستی کا الزام عاید کرنے سے صرف ایک ہفتہ قبل گاندھی جی برطانوی سامراج کے حق میں یہ عجیب و غریب اعلان فرما چکے تھے

> تھوڑی دیر کے لئے غور کیجئے کہ اگر انگریز اچانک ملک کو خالی کر دیں تو کیا ظہور پذیر ہوگا؟ اگر ملک میں حکومت کرنے کے لئے کوئی بیرونی حکومت موجود نہ ہو تو اس بات سے انکار کرنا مشکل ہے کہ پنجابی خواہ وہ مسلمان ہوں یا سکھ ہندوستان کو اپنی جولاں گاہ بنا لیں گے .... ہم نے ملک میں جمہوریت کا جو ڈھونگ رچا رکھا ہے تو وہ صرف انگریزی سنگینوں کی امداد پہ منحصر ہے پس اگر کسی کو یہ ضرورت ہے کہ کسی طاقتور عنصری دستبرد سے ملک کو بچانے کے لئے انگریز یہاں موجود رہیں تو وہ کانگریسی ہندو اور دیگر لوگ ہیں جن کی نمائندگی کا کانگریس کو دعویٰ ہے۔ (اسٹیٹسمین ۲۲ر اکتوبر ۱۹۳۹ء)

## ایک اہم انتباہ

ایک طرف گاندھی جی کو انگریزوں کے اچانک چلے جانے کا غم یوں ستا رہا تھا اور دوسری طرف مسٹر جناح انگلستان کے شہرۂ آفاق روزنامہ لنڈن ٹائمز کے ایک مقالہ کا جواب دیتے ہوئے برطانیہ پہ واضح کر رہے تھے

> میں بلا خوف و تردید یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مسلم لیگ، ملتِ اسلامیہ کی نمائندگی اس سے زیادہ صحیح معنوں میں اور موثر طریق پہ کر رہی ہے جس طرح کہ ملک معظم کی موجودہ حکومت برطانوی قوم کی کر رہی ہے۔ اگر اخبار

در نائمز" کا یہ خیال ہے کہ حکومت برطانیہ کے سائے میں مسلمانوں کی رضامندی اور منظوری کے بغیر کوئی فیصلہ ان کے سر منڈھا جا سکتا ہے تو وہ شدید غلط فہمی میں مبتلا ہے مسلمان قطعاً اس کے لئے تیار نہیں کہ اپنی تقدیر اور مستقبل کو کسی دوسرے کے ہاتھ میں چھوڑ دیں۔ یہ آخری فیصلہ خود مسلمان ہی کر سکتے ہیں کہ کیا کچھ ان کے لئے بہتر ہے۔ بنابریں وہ تمام عناصر جو ہندوستان کے مستقبل کی تشکیل میں حصہ دار ہیں ان سب پر لازم ہے کہ مسلمانوں کو ایک معزز اور ذمہ دار قوم متصور کریں۔ (جنگ ۔ مسئلہ دستور ہند)

جنوری ۱۹۴۰ء کے وسط میں قائداعظم نے راجکوٹ سے ایک اہم بیان جاری کیا۔ اس بیان میں وہ حکومت برطانیہ کو بھی مخاطب کرتے ہیں۔ قوم کی تنظیمی قوت بھی کتنی اہم شے ہے اور پھر اس پر ان کا پرجلال انداز تخاطب۔ انہوں نے فرمایا۔

میں انتباہ کئے دیتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ وائسرائے اور حکومت برطانیہ پورے طور پر اس حقیقت کو سمجھ لیں گے کہ اگر ماضی کی صورت حال کا اعادہ کیا گیا یا ان ضمانتوں کو پورا نہ کیا گیا جو دی جا چکی ہیں یا ان کا احترام ملحوظ نہ رکھا گیا تو ہندوستان میں نہایت ہی خطرناک صورت حال پیدا ہو جائے گی مسلم ہندوستان ان تمام ذرائع سے جو اس کے اختیار میں ہیں ایسی صورت حال کا مقابلہ کرے گا اور کسی قربانی سے دریغ نہیں کریگا (ایضاً)

## اعترافِ حقیقت

قائداعظم کی یہی جرأت رندانہ تھی اور آزادی کے حصول کے یہی ولولے تھے جن سے ہر آزادی پسند شخصیت شدید طور پر متاثر ہوئی چنانچہ نومبر ۱۹۳۹ء کے آغاز میں جب پنڈت جواہر لال نہرو نے ان سے شرف ملاقات حاصل کیا تو ملاقات کے بعد اخباری نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے کانگریس کے اس ممتاز رہنما نے برملا کہا۔

ہماری باتیں بالکل کھلی کھلی ہوئیں اگرچہ ہمارے زاویۂ نگاہ میں فرق ہے لیکن جہاں تک مطمع نظر کا تعلق ہے لیگ اور کانگریس میں کوئی اختلاف نہیں۔ دونوں کا نصب العین آزادی ہے۔ (اسٹیٹس مین ۷ نومبر ۱۹۳۹ء)

## یومِ نجات

۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو اسلامیان ہند نے قائداعظم کی اپیل پر "یوم نجات" منایا۔ یوم نجات کے ملک گیر، منظم اور عدیم المثال مظاہرے اس قوت تنظیم کے بے مثال مظہر تھے جو قائداعظم کی قیادت میں صدیوں کے بعد پہلی بار اس برصغیر کے مسلمانوں میں پیدا ہوئی۔ "یوم نجات" کا پس منظر یہ تھا کہ مسلم لیگ کے مسلسل مطالبہ کے پیش نظر حکومت برطانیہ نے فیڈرل سکیم کو جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کا جزو لاینفک تھا معطل کر دیا۔ وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو نے اس سلسلہ میں پہلے ۱۱ ستمبر ۱۹۳۹ء کو مرکزی اسمبلی میں ملک معظم کا پیغام پڑھ کر سنایا اور پھر ۱۸ ستمبر کو ایک وضاحتی بیان میں بتایا کہ:

ملک معظم کی گورنمنٹ نے مجھے یہ اعلان کرنے کا اختیار دیا ہے کہ اختتام جنگ پر وہ خوشی سے مختلف فرقوں، پارٹیوں اور مفادات کے نمائندوں اور والیان ریاست سے مشورہ کریں گے تاکہ اس قسم کی ترمیمات کرنے

میں جو مناسب معلوم ہوں ان کی مدد اور تعاون حاصل کیا جائے۔

مسلم لیگ کے اس مطالبہ کے جواب میں کہ ملک کی آئینی ترقی کے بارے میں اس سے مشورہ اور منظوری حاصل کئے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے گا مذکورہ سرکاری اعلان میں کہا گیا۔

یہ ناقابل تصور ہے کہ ہم ہندوستان کے آئندہ دستور حکومت کے کسی اہم جزو کو از سر نو وضع کرنے بیٹھیں یا اس میں کسی اعتبار سے ترمیم کریں اور یہ بغیر ان سے (مسلمانوں سے) مشورہ کئے ہو۔

فیڈرل اسکیم کے اس طرح معرض التوا میں پڑ جانے سے کانگرس کے ہندو راج کے منصوبے خاک میں مل گئے۔ اس نے برطانیہ کو جنگ عظیم کے خطروں میں گھرا دیکھ کر کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کے قیام کا مطالبہ کر دیا اور اس سلسلے میں حکومت کو مرعوب کرنے کے لئے ۲۲ اکتوبر کو سات صوبوں کی کانگرسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں۔ کانگرسی رہنما اس خود فریبی اور خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ دوران جنگ میں ان کا یہ اقدام انگریز کو ان کے مطالبہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دے گا اور دنیا کی رائے عامہ بھی ان کی تائید کرے گی۔ یہ تھی وہ راہ جس پر چل کر کانگرس کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی اور اس طرح پورے ملک پر اپنے استبداد کا سکہ بٹھانا چاہتی تھی لیکن اس نے اس حقیقت کو محسوس نہ کیا کہ اب ایک نئی قوت پورے نظم و ضبط کے ساتھ ابھر کر اس کے مقابلے میں آ چکی ہے اور اسے وہ قیادت حاصل ہے جو ۹ کروڑ مسلمانوں پر استبداد کے سارے منصوبوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گی۔ کانگرس نے بساطِ سیاست پر ابھی اس مہرے کو مشکل حرکت دی تھی کہ قائداعظم اپنے مخصوص قاہرانہ جلال سے مقابلے میں آ گئے اور انھوں نے اسلامیان ہند کے نام یہ اپیل شائع کر دی کہ کانگرس کے مہاسبھائی استبداد اور غلبہ و استیلاء سے نجات حاصل کرنے کی خوشی میں یوم نجات منایا جائے۔ قائداعظم کی اس اپیل پر ملک کے طول و عرض سے صدائے لبیک بلند ہوئی۔ دیگر اقلیتیں بھی ان مظاہروں میں مسلمانوں کے شانہ بشانہ کھڑی تھیں اور ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو ملک کے طول و عرض میں "یوم نجات" اس ولولے اور منظم جوش و خروش سے منایا گیا کہ مسلم لیگ کی ہمہ گیر قوت تنظیم اور قائداعظم کی عدیم النظیر فراست کی دھاک برطانیہ اور کانگرس دونوں پر بیٹھ گئی۔ اور کانگرس اپنے ان مظالم کی بنا پر جو اس نے نشۂ اقتدار میں اقلیتوں پر ڈھائے تھے اپنی فتح کے ڈنکے بجانے کے بجائے عدل و انصاف کی بارگاہ میں مجرم بن کر کھڑی تھی۔ "یوم نجات" کو روکنے کے لئے کانگرس نے تمام حربے استعمال کئے گاندھی جی نے اپیل شائع کی اور پنڈت جواہر لال نے قائداعظم سے ملاقات کے لئے سلسلہ مراسلت قائم کیا اور اس اپیل اور مراسلت میں بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر اس اقدام کے روکنے کی خواہش کی لیکن اس انذار غیبی کو روکنا کسی کے بس کا روگ نہیں تھا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی اکثریت کے جنون میں کانگرس نے اقلیتوں کے خلاف ظلم کی جس دو دھاری تلوار کو استعمال کیا تھا اور ان کی قومی آرزوؤں کو پامال کرنے میں جو دیدہ دلیری دکھائی تھی اس کی صدائے بازگشت سے فضاؤں میں لرزہ طاری ہو گیا۔

**با حدیث دیگراں** مشہور صحافی مسٹر آرتھر مور اپنے ایک مقالہ میں جو "ہماری جنگ" کے عنوان سے ... [illegible]

میں شائع ہوا قائداعظم کی عظیم فراست کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے :-

ایسے نازک وقت میں ایسا محکم اور اتنا جلد فیصلہ مسٹر جناح کے جوہر قیادت کی ایک ایسی دلیل ہے جس کا مقابلہ اگر کیا جا سکتا ہے تو مسٹر چرچل کی اس تقریر سے جو انہوں نے جرمنی کے روس پر حملہ آور ہونے کے وقت کی تھی۔

(اسٹیٹس مین - ۲۳ نومبر ۱۹۴۱ء)

## دستور ساز اسمبلی کا مطالبہ

انہی ایام میں وزارتوں سے مستعفی ہونے کے بعد کانگرس کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کے سوال کو مختلف طریقوں سے ابھار کر منظر عام پر لا رہی تھی۔ گاندھی جی اس سلسلے میں "ہریجن" میں دھڑا دھڑ مضامین شائع کر رہے تھے اور ان میں مسلم لیگ کے خلاف الزام بازیوں کی مہم بھی شروع کر رکھی تھی۔ یکایک وہ ایک قدم آگے بڑھے اور برطانوی رائے عامہ کو متاثر کرنے کے لئے "نیوز کرانیکل" میں ایک مضمون شائع کرا دیا یہ مضمون کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کے مطالبہ کی وضاحت اور حمایت میں تھا۔ قائداعظم دیر سے ہریجن میں شائع شدہ الزام بازیوں کا خاموشی سے مطالعہ کر رہے تھے لیکن جوں ہی نیوز کرانیکل میں گاندھی جی کا مضمون شائع ہوا وہ دلائل سے مسلح ہو کر میدان میں آ گئے اور ایک ہی ٹھوکر سے پروپیگنڈے کے اس گھروندے کو پاش پاش کر دیا جو نیوز کرانیکل کے ذریعے گاندھی جی نے تیار کرنے کی کوشش کی تھی۔ اخبارات کے نام اپنے بیان میں انہوں نے صاف اور واشگاف الفاظ میں اعلان کیا۔

مسٹر گاندھی جیسے شخص کا اس سے زیادہ فتنہ پردازانہ بیان اور نہیں ہو سکتا اور افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ وہی گاندھی ہیں جو راست بازی کے مبلغ بنتے ہیں۔

اب جب کہ کانگرس کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے یعنی یہ کہ وہ ہندوستان کی نمائندہ نہیں مسٹر گاندھی نے پسند فرمایا ہے کہ وہ کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کے موید بن جائیں۔ جو ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ کانگرس کی مہا بھائی ذہنیت کا دوسرا اور زیادہ ضخیم ایڈیشن ہے .....

وہ (مسٹر گاندھی) برطانیہ کے دوست کی حیثیت سے جس کے ساتھ ان کے بہت ہی گہرے ذاتی تعلقات ہیں اس کے لئے اضطراب ظاہر فرماتے ہیں کہ وہ فتح یاب ہو۔ اور وہ بھی اس لئے نہیں کہ ذرائع حرب کے استعمال میں افضل ہے بلکہ اس لئے کہ اس کا یہ ارادہ ہے کہ انتہا تک "حق" پر قائم رہے لہٰذا وہ اس کے لئے مضطرب ہیں کہ برطانیہ اپنی فتح مندی کے لئے ان کا اتباع کرے۔

## حقیقت پسندی کی دعوت

انہوں نے بڑی تفصیل سے گاندھی جی کے اس بیان کا تجزیہ کیا اور ان کے دلائل کے تضاد کو واضح کرتے ہوئے آخر میں فرمایا :-

میری تمنا ہے کہ مسٹر گاندھی اس قسم کی رائیں شائع کرنا بند کر دیں جو ہر روز اور ہر ہفتہ بدلتی رہتی ہیں۔ اور اپنے

دماغ کو اس مسئلہ کے حل پر لگائیں جو اہمیت کے لحاظ سے ایک ہی ہے یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے تصفیہ کا مسئلہ ـــــ کانگرس کے لیڈروں میں وہی ایسے شخص ہیں جو ہندوؤں کی ہندوؤں کی حیثیت سے نمائندگی کر سکتے ہیں۔ اور ہندوؤں کی طرف سے مختار انہ عمل کے ذریعے ملک کی سب سے بڑی دو قوموں میں سمجھوتہ کرا سکتے ہیں۔ پھر جو ہونے والا ہے ہوتا رہے گا۔ مجھے اس پیش کش کو دہرانے کی ضرورت نہیں کہ باعزت سمجھوتہ کے لئے میں مسلمانوں کی طرف سے ہر وہ امداد دینے کو تیار ہوں جو میرے اختیار میں ہے۔ (مسئلہ دستور ہند)

## سیاسی امراض اور ان کا علاج

قائداعظم مزید آگے بڑھے اور انہوں نے "نیوز کرانیکل" میں گاندھی جی کے شائع کردہ مذکورہ مضمون کے جواب میں ۱۹ جنوری ۱۹۴۷ء کو انگلستان کے اخبار "ٹائم اینڈ ٹائڈ" میں ایک اہم مضمون حوالہ اشاعت کیا۔ اس مضمون کا عنوان تھا ـــــ "ہندوستان کے سیاسی امراض اور ان کا علاج" ـــــ اس مضمون میں انھوں نے اپنی مخصوص قوتِ استدلال سے ان دستوری عوارض کی وضاحت کی جو اس برصغیر کے جسد سیاسی کو لاحق تھے اور بالتفصیل بتایا کہ جمہوریت کے مروجہ تصور کو جو مغربی ذہن کی پیداوار ہے اس ملک پر مسلط کرنا جہاں ایک سے زیادہ اقوام آباد ہیں ناقابل برداشت تصور کیا جائے گا۔ انہوں نے دستوری اصلاحات سے متعلق جوائنٹ سیلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ کا حسب ذیل اقتباس اٹل شہادت کے طور پر پیش کیا جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی جداگانہ حیثیتوں پر یوں تبصرہ کیا گیا تھا:۔

ان دونوں کے درمیان جو فرق ہے وہ سخت تر مفہوم کے اعتبار سے مذہب ہی کا فرق نہیں بلکہ نظام حیات اور ثقافت کا بھی تفاوت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دونوں ممیز اور جداگانہ تہذیبوں کے نمائندے ہیں۔ ہندومت ذات پات کے اس مظاہرے سے متعارف ہوتا ہے جو اس کے مذہبی اور معاشرتی نظام کی بنیاد ہے۔ دوسری طرف اسلام ہے جو انسانی مساوات کے اصول پر مبنی ہے۔ (مسئلہ دستور ہند)

اس شہادت کے ساتھ ہر دو اقوام کے مابین بیّنہ امتیاز کو واضح کرتے ہوئے قائداعظم نے بتایا کہ ایسی صورت میں مغربی جمہوریت کے اصولوں پر کسی دستور کی تشکیل و تنفیذ یہاں ہندو اکثریت کے غلبے اور استبداد کا پیش خیمہ ثابت ہوگی اور پھر انہوں نے کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کے قیام کے سلسلے میں گاندھی جی کی بے تابیوں کی نقاب کشائی کرتے ہوئے برطانوی عوام کو بتایا:۔

مسٹر گاندھی جو صف اوّل کے ایک ہوشیار ہندو سیاست دان ہیں کی قیادت میں کانگرس نے (جو بالخصوص ایک ہندو جماعت ہے) بہت دنوں پہلے پیش بینی کر لی تھی کہ مغربی جمہوریت کے اندر ہندوؤں کے لئے تمام ہندوستان پر مستقل غلبہ حاصل کرنے کی امیدوں کی تکمیل کا سامان پوشیدہ ہے۔ چنانچہ ان کی تمام کوششیں اور قوتیں اس پر مرکوز ہو گئیں کہ ہندوستان کے لئے ایک جمہوری طرز کی حکومت حاصل کی جائے۔ انہوں

نے یہ کہہ دیا تھا کہ اگر نئے دستور کو ان اصولوں پر چلایا جا سکے جو ان کے لیڈر اور ورکنگ کمیٹی نے ترتیب دیئے تھے تو نیا دستور انہیں منزلِ مقصود کے انتہائی قریب پہنچا دے گا۔ (ایضاً)

پھر انہوں نے صوبائی وزارتوں میں کانگرسی مظالم کے تلخ تجربات کی تفصیل پیش کرتے ہوئے برطانوی عوام سے سوال کیا کہ :-

آیا برطانوی عوام کی خواہش یہ ہے کہ ہندوستان ایک ایسی ہمہ گیر مطلق العنان ہندو مملکت کی شکل اختیار کر لے جس کی مرکزی اور صوبائی حکومتیں مجالس قانون ساز یا رائے دہندگان کی بجائے اس سیاسی مجلس کے سامنے جواب دہ ہوں جس کا نام کانگرس کمیٹی ہے، اور جس کی نظیر دنیا کے کسی دستور میں موجود نہیں۔ برطانوی عوام کو یقین کر لینا چاہئے کہ اگر کانگرس کا یہ مطالبہ منظور کر لیا گیا کہ ہندوستان کو ایک دستور ساز اسمبلی کے ذریعے دستور بنانے کا حق حاصل ہو تو حالات لامحالہ یہی صورت اختیار کریں گے۔ (ایضاً)

اس مرحلہ پر انہوں نے برطانوی حکمرانوں کو دو ٹوک الفاظ میں یوں خبردار کیا :-

اگر برطانوی حکومت اچانک طور پر (اس مطالبے سے) ہراساں ہوگئی اور جنگ کی وجہ سے پیدا شدہ صورت حال کے تنکوں میں ڈوبتے ہوئے گھٹنے ٹیک گئی تو ہندوستان انتہائی نازک صورت حال سے دوچار ہو جائے گا اس کے نتائج کے بارے میں آج کوئی شخص پیش گوئی نہیں کر سکتا لیکن میں یقیناً یہ محسوس کرتا ہوں کہ اسلامی ہند کسی قیمت پر ایسی پوزیشن پیدا ہونے نہیں دے گا۔ وہ اپنی وہ تمام قوت اور ذرائع جو اسے حاصل ہیں اس کے مقابلے میں بروئے کار لے آئے گا۔ (ایضاً)

## گاندھی جی سے سلسلۂ مراسلت

تحریک پاکستان کے پس منظر کے ان تدریجی مراحل کو پیش کرتے ہوئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس مقام پر اس سلسلۂ مراسلت کے بعض نمایاں گوشے منظر عام پر لائیں جو انہی ایام میں قائداعظم اور کانگرسی رہنماؤں (گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو) کے مابین جاری تھا۔ ہمارے سامنے سب سے پہلے وہ خط آتا ہے جو گاندھی جی نے "یوم نجات" کے مظاہروں سے متاثر ہو کر قائداعظم کے نام لکھا۔ اس خط کے ساتھ اس نوٹ کی ایک نقل بھی منسلک تھی جو وہ اپنے اخبار "ہریجن" میں شائع کر رہے تھے۔ اور اس میں انہوں نے قائداعظم کی یوم نجات سے متعلقہ اپیل کو یہ معنی پہنانے کی کوشش کی تھی کہ اس سلسلے میں غیر مسلم اقلیتوں کے اشتراک سے وہ (قائداعظم) دراصل کانگریس کے خلاف ایک محاذ قائم کرنے میں کوشاں ہیں۔ گاندھی جی کے ۱۶ جنوری ۱۹۴۰ء کے اس مراسلہ کا جواب دیتے ہوئے قائداعظم نے انہیں لکھا :-

مجھے اس بات سے مسرت حاصل ہوئی کہ آخر آپ کو معلوم ہو گیا کہ "یوم نجات" کی اہمیت اور حقیقی معنی کیا ہیں یقیناً یہ درست ہے کہ بہت سے غیر کانگرسی ہندوؤں نے یوم نجات اور ہمارے مفاد سے ہمدردی ظاہر کی ہے۔ اسی طرح جسٹس پارٹی، ہریجنوں اور پارسیوں نے بھی جو کانگرس کے مصائب کا شکار ہوئے ہیں یوم نجات کی تقریب

میں حصہ لیا۔ تاہم مجھے خدشہ ہے کہ آپ نے اس مظاہرہ کو غلط معنی پہنانے کی کوشش کی ہے۔ غیر مسلموں کی یوم نجات کے مظاہروں میں شرکت کی وجہ ایک حد تک یہ بھی تھی کہ مصیبت نے سب کو ایک پلیٹ فارم پہ لاکھڑا کیا ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ مشترکہ مفاد نے اقلیتوں کو متحد ہونے کی ترغیب دی ہو۔

مجھے اس امر میں کبھی شبہ نہیں ہوا۔ اور میں ایک بار پھر یہ اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں نہ تو ایک قوم بستی ہے اور نہ میں اسے ایک ملک سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ ایک برِ اعظم ہے جس میں مختلف قومیں آباد ہیں اور ان میں ہندو اور مسلمان دو بڑی اقوام ہیں۔ آج آپ بے شک اس سے انکار کریں کہ قوم مذہب کی بنا پر نہیں بنتی لیکن ایک موقعہ پہ جب آپ سے دریافت کیا گیا تھا کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ مجلسی جذبہ کی تحریک کا نتیجہ ہوتا ہے یا سیاسی اور مذہبی جذبہ کی تحریک کا تو آپ نے فرمایا تھا کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں خالص مذہبی جذبہ سے متحرک ہو کر کرتے ہیں۔

اس وضاحت کے بعد قائداعظم نے گاندھی جی سے حقیقت پسندی کے نام پہ یہ اپیل کی کہ :-

مجھے امید ہے کہ معجوزہ بازی کے خبط کو ترک کر کے آپ ہندوستان کو خوشی اور اطمینان کی طرف لے جانے کی جدوجہد میں اپنا مناسب پارٹ ادا کریں گے۔ حالات بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں۔ ہماری سیاست کے علمبردار کی حیثیت سے ہفتہ وار ہریجن میں آپ کے جو مذہبی اور فلسفیانہ مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں ان سے ہندوستان آزاد نہیں ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ ستیہ گرہ، کھدر اور چرخہ کے عجیب و غریب اصولوں سے ہندوستان کو آزادی حاصل ہو سکتی ہے عمل اور تدبر کی مدد سے ہی ہم اس منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اب آپ سچی قومی خدمت کے بلند معیار پہ پہنچنے کی کوشش فرمائیں گے۔ اور ملکی جدوجہد میں مناسب پارٹ ادا کر کے ہندوستان کو مسرت اور اطمینان کی زندگی کی طرف لے جائیں گے۔

## گلاب کا پھول

اس خط کے آخری حصہ میں قائداعظم کی لطافتِ طبع اور رفعتِ کردار کی ایک دل کشا جھلک بھی سامنے آتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

آخر میں مجھے اس بات کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ آپ یہ جاننے کے لئے بے تاب ہیں کہ میں اپنے نام کے ساتھ کس لقب کو پسند کروں گا۔ آخر ان القابوں میں رکھا کیا ہے؟ گلاب کے پھول کو کسی نام سے بھی پکاریئے اس کی دلآویز خوشبو میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ اس لئے میں اس معاملہ کو آپ ہی کی پسند پر چھوڑتا ہوں اور اس سلسلہ میں میری اپنی کوئی خواہش نہیں یقین فرمایئے کہ میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ لقب کے معاملہ میں آپ کو میرے متعلق اس قدر تشویش کیوں لاحق ہے؟

(مسئلہ دستور ہند)

## جواہر لال سے مکاتبت

اب ہم اس مراسلت کی طرف آتے ہیں جس کا آغاز پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے یکم دسمبر ۱۹۳۹ء کے خط سے کیا۔ پنڈت جی نے اس خط میں قائداعظم کو لکھا:-

جب ہم پہلی مرتبہ دہلی میں ملے تھے تو یہ طے ہوا تھا کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے لئے ہمیں پھر ملنا چاہئے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ بمبئی واپس پہنچ کر آپ مجھے اس سلسلہ میں ملاقات کے متعلق تحریر فرمائیں گے۔ میں اسی وقت سے آپ کے خط کا منتظر ہوں ..... سر سٹیفورڈ کرپس جلد ہندوستان آرہے ہیں اور اس ملک میں دو تین ہفتے گذاریں گے وہ ہندوستان کے راستے چین جا رہے ہیں ..... اگر ممکن ہو تو اپنے اس مختصر قیام میں وہ آپ سے بھی ملنا چاہتے ہیں ..... کیا ازراہ کرم آپ مجھے یہ بتا سکتے ہیں کہ آپ اس ماہ کے تیسرے ہفتے یا اس کے بعد بمبئی میں ہوں گے؟ ان معلومات کے ذریعے انہیں اپنا پروگرام متعین کرنے میں سہولت ہوگی۔ وہ بذریعہ ہوائی جہاز آرہے ہیں اور الہ آباد میں اتریں گے

قائداعظم نے ۸ دسمبر کو اپنے جوابی خط میں لکھا :-

..... میں آئندہ دو یا تین ہفتے بمبئی میں رہوں گا۔ اگر اس دوران میں سہولت ہو تو مجھے آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوگی ..... سر سٹیفورڈ کرپس کے متعلق یہ ہے کہ ان کا ایک خط مجھے موصول ہوا ہے اور میں نے ان کی ہدایت کے مطابق آپ کے پتہ پر جواب دے دیا ہے۔ لہٰذا جب وہ بمبئی آئیں گے تو ان سے ملاقات ہو جائے گی اور جب وہ مجھے لکھیں گے تو میں کوئی ایسی تاریخ مقرر کر دوں گا جو ان کے لئے موزوں ہو۔

۹ دسمبر کو پنڈت جی نے ایک اور خط لکھا۔ اس میں تحریر تھا :-

دو روز ہوئے میں نے آپ کو ایک خط لکھا ہے جس میں میں نے آپ کو اطلاع دی ہے کہ میرا جلد بمبئی آنے کا ارادہ ہے۔ اور وہاں آپ سے ملنے کی امید ہے۔ کل صبح میں نے اخبارات میں آپ کا وہ بیان پڑھا جس میں آپ نے ۲۲ تاریخ اس غرض کے لئے مقرر کی ہے کہ کانگریسی حکومتوں کا دور حکومت ختم ہونے پر یوم نجات منائیں ..... کل سے مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ تکلیف دی وہ یہ احساس ہے کہ ہماری زندگی کے مقاصد، قیمتوں کے اندازوں اور سیاسیات میں بہت ہی بعید فرق ہے .....

نتیجہ خیز گفتگو کے لئے یہ ضروری ہے کہ گفتگو کے لئے کوئی مشترکہ بنیاد موجود ہو۔ میرے خیال میں آپ کی طرف سے بھی اور خود اپنی طرف سے بھی مجھ پر یہ واجب ہے کہ میں اس دشواری کو آپ کے روبرو پیش کروں

قائداعظم نے اس کے جواب میں اپنے مکتوب میں تحریر فرمایا :-

..... مجھے آپ سے اتفاق ہے کہ گفتگو کے نتیجہ خیز ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے لئے کوئی مشترک بنیاد اور کوئی مشترکہ مقصد ہو جس کا حصول پیش نظر ہو۔ اس لئے دہلی کی گفتگو میں جو گذشتہ اکتوبر میں ہوئی میں نے آپ اور مسٹر گاندھی پر یہ واضح کر دیا تھا کہ اول جب تک کانگرس مسلم لیگ کو مسلمانوں

کی واحد نمائندہ اور مختار مجلس تسلیم نہ کرے اس وقت تک ہندو مسلم سمجھوتے کی گفتگو ممکن نہیں کیونکہ عاملہ مسلم لیگ نے یہی بنیاد معین کر دی تھی۔ دوم یہ کہ اس سے قطع نظر کہ کانگرس کا وہ مطالبہ جو اس نے حکومت برطانیہ سے اعلان کے متعلق کیا ہے اور جو عاملہ کانگرس کے ریزولیشن میں درج ہے ...... ہم اس وقت تک اس کی تائید نہیں کر سکتے جب تک کہ اقلیت کے مسئلہ کا تصفیہ نہ ہو جائے۔

مسلم لیگ اس اعلان سے بھی مطمئن نہیں جو وائسرائے نے کیا تھا۔ اگر خوش نصیبی سے ہم ہندو مسلم مسئلہ حل کر لیتے تو ہم اس قابل ہو جاتے کہ حکومت برطانیہ سے مطالبۂ اعلان کے متعلق ایسا متفقہ اصول وضع کر لیں جس سے ہم مطمئن ہو سکیں۔ مسٹر گاندھی اور آپ نے دہلی میں نہ تو میری پہلی تجویز منظور کی اور نہ دوسری بلکہ آپ نے ازراہ کرم مجھ سے دوبارہ ملنے کی خواہش ظاہر کی اور میں نے کہا کہ میں آپ سے مل کر ہمیشہ خوش ہوں گا ......

قائداعظم نے مذکورہ بالا خط ۱۲ ستمبر کو لکھا۔ پنڈت جی ان دنوں بمبئی میں ہی تشریف فرما تھے۔ اور یہ خط انہیں بمبئی کے پتہ پر ہی موصول ہوا۔ اب ہم ان کے اس جوابی مکتوب کی طرف آتے ہیں جو انہوں نے ۱۴ ردسمبر کو اپنی بمبئی کی قیامگاہ سے قائداعظم کے نام تحریر فرمایا۔ اس خط میں پنڈت جی لکھتے ہیں:-

...... اپنے خط میں آپ نے دو ایسی ابتدائی شرائط پر زور دیا ہے جو اس سے قبل کہ کوئی مشترکہ بنیاد پیدا ہو پوری ہونی چاہئیں ..... کانگرس نے ہمیشہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نہایت اہم اور با اثر انجمن سمجھا ہے اور ہم اسی وجہ سے اس کے متمنی ہیں کہ ہمارے درمیان جو اختلافات ہیں وہ رفع ہو جائیں۔

لیکن بظاہر جو کچھ آپ تجویز فرما رہے ہیں۔ وہ اس سے کوئی زیادہ بڑی بات ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم کسی قسم کا انکاری اعلان کریں اور ان مسلمانوں سے برأت اور علیحدگی اختیار کریں جو لیگ میں نہیں ہیں ..... یہ ممکن نہیں کہ ہم ان سے برأت اختیار کر لیں یا انہیں اپنے سے الگ کر دیں ...
اگر آپ کی یہ خواہش ہے کہ لیگ کو ایسی جماعت تسلیم کیا جائے جو تمام مسلمانوں کی واحد نمائندہ ہے تو ہم اسے تسلیم کرنے سے قطعی طور پر قاصر ہیں ..... آپ نے دوسری بات یہ فرمائی ہے کہ مسلم لیگ کانگرس کے اس مطالبہ کی تائید نہیں کر سکتی جو اس نے برطانیہ سے اعلان مقاصد کے لئے کیا ہے ....
اگر مسلم لیگ اس سے متفق نہیں ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ہمارے سیاسی مقاصد بالکل مختلف ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کانگرس اس (مطالبہ) کو کس طرح چھوڑ سکتی ہے یا بدل سکتی ہے؟ میں ذاتی طور پر اس کوشش کی مخالفت کروں گا جو اس کے بدلنے کے لئے ہو۔

قائداعظم نے پنڈت جی کے اس طویل خط کے جواب میں ۱۵ دسمبر کو ایک مختصر لیکن جامع جواب ارسال فرمایا اور اس میں واضح کیا کہ :-

...... مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ دوسری بات کے متعلق آپ میرے مفہوم کو سمجھ نہیں سکے میں نے یہ نہیں کہا کہ مسلم لیگ کانگرس کے اس مطالبہ کی تائید نہیں کر سکتی جو اس نے اعلانِ مقاصد کے متعلق برطانیہ سے کیا ہے میں نے جو کچھ کہا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کانگرس کے اس مطالبہ کی تائید اس صورت میں نہیں کر سکتے جس صورت میں وہ عاملہ کانگرس کے ریزولیشن میں درج ہے ...... اور اس کی وجوہ میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں۔

اگر کانگرس اس ریزولیشن میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی نہیں کر سکتی اور جیسا کہ آپ نے کہا ہے کہ آپ ذاتی طور پر اس تبدیلی کی ہر کوشش کی مخالفت کریں گے اور پھر جیسا کہ آپ نے واضح فرمایا ہے کہ آپ یہ بالکل نہیں کر سکتے کہ مسلم لیگ کو مسلمانانِ ہند کی واحد اور مختار نمائندہ جماعت تسلیم کریں تو پھر ان حالات میں آپ مجھ سے کیا توقع رکھتے ہیں اور کیا چاہتے ہیں کہ میں کروں ؟

اب ہمارے سامنے پنڈت جی کا ۱۶ دسمبر کا وہ خط آتا ہے جو اس سلسلۂ مراسلت کی آخری کڑی ہے کیونکہ سابقہ مراسلت اور اس خط کے مندرجات کی روشنی میں قائداعظمؒ نے اس کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ پنڈت جی کے اس خط میں ۱۴ دسمبر کے خط میں اختیار کردہ موقف کی تکرار کے سوا اور کوئی روشنی نظر نہیں آتی۔ وہ لکھتے ہیں :-

...... میں اس فرق کو سمجھا جو آپ نے واضح فرمایا۔ بے شک مسلم لیگ کسی اعلان کے خیال کی مخالفت نہیں کر سکتی ...... جنگ کے متعلق کانگرس نے گذشتہ گیارہ ماہ میں اپنی پالیسی کا بار بار اعلان کیا ہے۔ موجودہ اعلان اس پالیسی کا منطقی نتیجہ ہے ...... اس کی تفصیلات پر غور کیا جا سکتا ہے اور ان پر بحث ہو سکتی ہے۔ باہمی تعاون سے یہ طے ہو سکتا ہے کہ ان پر عمل کیونکر ہو۔ بالخصوص اقلیتوں اور دوسرے گروہوں کے مفاد پر احتیاط سے غور کیا جانا چاہئے اور ان کا تحفظ ہونا چاہئے لیکن اعلان کی اصل بنیاد پر ہی اعتراض کے معنی یہ ہیں کہ سیاسی تخیل اور پالیسی میں عظیم اختلاف موجود ہے۔

کیا میں پھر یہ عرض کر سکتا ہوں کہ ہم میں سے کوئی بھی مسلم لیگ کے اقتدار و اہمیت سے نہ انکار کرتا ہے اور نہ اس کو گھٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ اسی وجہ سے ہے کہ ہم اس کے متمنی ہیں کہ اس سے ملکی معاملات پر گفتگو کریں۔ اور ان دشوار مسائل کا قابلِ اطمینان حل تلاش کریں جو ہمارے سامنے ہیں ...... میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ حقیقی دشواری یہ ہے کہ سیاسی تصور اور سیاسی مقاصد میں اختلاف ہے۔

اس وقت ۲۲ دسمبر کے آل انڈیا مظاہرے (یوم نجات) نے ایک جذباتی روک پیدا کر دی ہے جو پوری قوت کے ساتھ باہمی ملاقات اور بحث میں مانع ہے۔ مجھے اس کا شدید افسوس ہے اور دل سے یہ خواہش رکھتا ہوں کہ آپ اس رکاوٹ کو دور کریں۔ جو ناراضگی کی طرف لئے جا رہی ہے۔ مجھے اب بھی امید ہے کہ آپ ایسا کر سکتے ہیں ...... میں بہت ہی گہرے سیاسی عقائد رکھتا ہوں اور میں نے ان کے مطابق سالہا سال جدوجہد کی ہے۔ میں ان کو کبھی چھوڑ نہیں سکتا خصوصاً اس وقت جبکہ دنیا شدید اور ہولناک خطرہ میں مبتلا ہے۔

اس خط کے محولہ بالا مندرجات کا جائزہ لیجئے بالخصوص آخری حصہ کا۔ اور پھر سوچئے کہ قائداعظم اس کا کیا جواب دیتے۔ قائداعظم کی دوربین نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ دس کروڑ مسلمانوں کی قوت تنظیم اور عزم صمیم کے سامنے ایک دن یہ خودسری کی چوٹیاں ختم ہو کر رہیں گی۔ چنانچہ ان کی خاموشی کا مخصوص اور پُروقار انداز ہی اس خط کا موزوں ترین جواب تھا اور حالات نے بتا دیا کہ کانگرس کو بالآخر وہی مقام قبول کرنا پڑا جو قائداعظم نے اپنے آخری خط میں اس کے لئے تجویز کیا تھا۔

## وائسرائے ہند سے خط و کتابت

اس مرحلہ پر اس خط و کتابت کا ذکر بھی تحصیل حاصل ہوگا جو قائداعظم اور وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو کے مابین انہی ایام میں جاری تھی۔ اس کا آغاز قائداعظم کے ۵ نومبر ۱۹۳۹ء کے پہلے مکتوب سے ہوا جس میں انہوں نے وائسرائے بہادر سے اپنے مذاکرات کی روشنی میں چند ضروری مطالبات کئے تھے۔ ان مطالبات میں اعراب فلسطین کے مطالبات کی تکمیل اور ہندوستانی فوجوں کو اسلامی ممالک کے خلاف استعمال نہ کرنے کی یقین دہانی طلب کی گئی تھی۔ اور ساتھ ہی خاتمہ جنگ پر ہندوستان کے دستوری مسائل کا ازسرنو جائزہ لینے کا مطالبہ شامل تھا۔ لیکن اس مکتوب میں ان کا اہم ترین مطالبہ یہ تھا کہ:-

ملک معظم کی حکومت یا پارلیمنٹ کی طرف سے ہندوستان کی دو بڑی قوموں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کی رضامندی اور منظوری کے بغیر اصولاً یا کسی جزئی طریق سے نہ تو کوئی اعلان کیا جائے گا اور نہ کوئی دستور یا قانون منظور کیا جائے گا۔

اسی دوران میں مراسلت کا سلسلہ جاری رہا لیکن وائسرائے بہادر کی طرف سے قطعی اور آخری جواب اُس وقت موصول ہوا جب انہوں نے ملک معظم کی حکومت سے ان امور کے متعلق بالتفصیل مشورہ کر لیا۔ برطانوی حکومت سے اس مشورہ کر لینے کے بعد انہوں نے ۲۳ دسمبر کو قائداعظم کے نام جو خط لکھا اس میں جہاں دیگر مطالبات کے بارے میں انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی وہاں مذکورہ اہم ترین مطالبہ کے متعلق انہیں بتایا گیا کہ

میں آپ کو یقین دلا سکتا ہوں کہ ملک معظم کی حکومت کو اس معاملہ میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے کہ ہندوستان کے آئینی استحکام اور ترقی کے لئے آپ کی قوم کا مطمئن ہونا کس قدر ضروری ہے۔ بنا بریں آپ کو اس معاملہ میں [illegible]

اندیشہ کی ضرورت نہیں کہ اپنی حیثیت کی وجہ سے ہندوستان میں آپ کی ملت کی رائے کو جو وزن حاصل ہے اُسے گھٹایا جائے گا۔

**منزل کی نشان دہی**

کانگرس اور حکومت کے مقتدر نمائندوں سے قائداعظم کے اس سلسلۂ مراسلت کے ساتھ ہی جس کی تفصیل سطور بالا میں پیش کی گئی ہے ہمارے سامنے ان کا وہ اہم بیان آتا ہے جو انہوں نے انگلستان کے ایک مشہور اخبار ڈیلی میل (DAILY MAIL) کے نمائندے کو دیا۔ اس بیان میں انہوں نے فرمایا۔

مسٹر گاندھی درحقیقت حکومت برطانیہ سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ وہ کانگرس کی درخواست پر بقیہ ملک کے سر ایسا نظام حکومت منڈھ دے جو کانگرس پارٹی نے معین کیا ہو۔ اگر مسٹر گاندھی حقیقی راہ عمل اختیار کرنا چاہتے ہیں تو وہ کیوں یہ مطالبہ نہیں کرتے کہ برطانیہ فوراً اپنی ذلت آفرین سنگینیں ہندوستان سے ہٹالے تاکہ ہندوستانی عوام مکمل آزادی اور خود مختاری کے ساتھ اپنے حق خود اختیاری کو بروئے کار لانے کا فیصلہ کر سکیں لیکن مسٹر گاندھی حکومت برطانیہ سے ایسا مطالبہ نہیں کریں گے کیونکہ انہیں بخوبی علم ہے کہ اگر ان حالات میں کانگرسی ٹولی نے اپنا موجودہ نصب العین جمہور ہند کے سر منڈھنے کی کوشش کی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

بعض حلقوں میں مسلم لیگ پر یہ بے بنیاد الزام بھی عائد کیا جاتا ہے کہ وہ موانع اور رکاوٹیں پیدا کر رہی ہے میں جانتا ہوں کہ اس کا سبب یہ ہے کہ انگلستان میں مسلم لیگ کے خلاف انتہائی غلط پروپیگنڈہ کیا گیا ہے مسلم لیگ کے طرز عمل کے متعلق یہ پروپیگنڈا قطعاً جھوٹ پر مبنی ہے مسلم لیگ نے ایک مثبت مطالبہ کیا ہے .... شد و مد سے باتیں کرنے کے بجائے ہم ہر وقت ٹھوس تجاویز پیش کرنے پر آمادہ رہے ہیں۔ لیکن اب تک وائسرائے یا ملک معظم کی حکومت نے ایسی خواہش کا اشارہ تک نہیں کیا۔

اس بیان کے آخر میں قائداعظم نے کانگرس اور برطانیہ دونوں کو یہ کہتے ہوئے پوری طرح خبردار کیا کہ :-

مجھے بتا دینا چاہئے کہ اب ایک بات یقینی ہے اور وہ یہ کہ اسلامی ہندوستان اپنے مستقبل یا اس ملک کے دستور کی تشکیل میں اپنے حقوق کو مسٹر گاندھی کے مفروضہ ٹریبونل یا کسی اور طرز کے ادارے کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑے گا۔ نہ اسلامیان ہند اس پر تیار ہیں کہ حکومت برطانیہ کے آخری فیصلہ کو قبول کریں۔ ہمارے لئے کیا کچھ بہترین ثابت ہو سکے گا اس کا قطعی اور آخری فیصلہ خود اسلامیان ہند کی منشا پر موقوف ہے اور وہی اس کے آخری جج ہوں گے۔ (مسئلہ دستور ہند)

**آؤ تیاری کریں**

اس بیان کے جلد بعد قائداعظم کو مولانا شوکت علی مرحوم کی ایک یادگار کی نقاب کشائی کی تقریب میں شرکت فرمانے کا موقع ملا۔ ان سے قبل مولانا ظفر علی خان ایک دھواں دھار اور ہنگامہ خیز تقریر کر چکے تھے چنانچہ جب قائداعظم خطاب کے لئے کھڑے ہوئے تو انہوں نے اس ہنگامی اور جذباتی

تقریر کی روشنی میں حاضرین کے جذبات و احساسات کا رُخ واقعات اور حقائق کی طرف پھیر دیا اور واضح کیا کہ جذبات کے دھارے پر بہنے کے بجائے اسلامیان ہند کو حقیقت پسندی سے سیاسیات ہند میں اپنے مقام کو سمجھنا چاہئے۔ انہوں نے حقیقت حال واضح کرتے ہوئے فرمایا :-

> مالی حیثیت سے ہم دیوالیے ہیں۔ اقتصادی لحاظ سے صفر اور تعلیمی نقطہ نظر سے پست ترین سطح پر کھڑے ہیں۔ اس لئے میں انتہائی سنجیدگی سے کہوں گا کہ اگر آپ اپنا حقیقی مقام و منصب حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اپنے آپ کو مسلح کیجیے اور اپنے اندر ضروری صلاحیتیں پیدا کیجیے۔ اس قسم کی گفتگو سے کوئی فائدہ نہیں کہ مسلمانوں نے صدیوں تک اس ملک پر حکومت کی ہے اور اب بھی ان کو حکومت کرنے کا حق ہے۔ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ محنت کرو اور استقلال سے اپنی جدوجہد جاری رکھو۔ ذمہ داری اور فرض شناسی کا احساس پیدا کیجئے

اس کے بعد انھوں نے سیاسی صورت حال کا یوں تجزیہ فرمایا۔

> برطانیہ اپنا اقتدار قائم رکھنے کا مدعی ہے۔ دوسری طرف مسٹر گاندھی ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتے ہیں ہم انکسار پسند لوگ ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم ان میں سے کسی کو نہ تو الگ الگ اور نہ مجموعی طور پر یہ اجازت دیں گے کہ وہ ہم پر حکومت کرے۔ دنیا جان چکی ہے اور برطانوی حکومت نے اپنی دُور اندیشی سے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ مسلم لیگ اور صرف مسلم لیگ اسلامی ہند کی واحد نمائندہ اور با اختیار مجلس ہے لیکن اگر کہیں روشنی طلوع نہیں ہوئی تو صرف سیواگاؤں ہیں ۔۔۔ مسٹر گاندھی ابھی تک اندھیرے میں بھٹک رہے ہیں۔

انہوں نے ایک حقیقت پسند سالار اعظم کی حیثیت سے اپنے ساز و یراق کی تفصیل بھی اپنے سپاہیوں کے سامنے واضح کر دی اور کہا :-

> اورنگزیب روڈ پر میری نجی قیام گاہ کو شاید قابل رشک سمجھا جائے مگر سیکریٹریٹ کہاں ہے اور فوج کہاں۔ میرا تمام اسلحہ خانہ صرف اس قدر ہے ۔۔۔ ایک اٹیچی کیس۔ ایک ٹائپ رائٹر اور ایک پرسنل اسسٹنٹ۔

اور اس کے ساتھ ہی ایک اٹل حقیقت کا یوں اظہار فرمایا :-

> اگرچہ میں نے یہ بات صاف اور واشگاف طور پر بیان کر دی مگر میں شکست تسلیم کرنے کا بھی قائل نہیں مجھے اپنی قوم پر پورا اعتماد ہے بلکہ میں اس کے خلاف ہوں کہ اپنی مشکلات کو کم کر کے دکھایا جائے۔ ان تمام مشکلات کے باوجود جو ہماری راہ میں حائل ہیں میرا اب بھی یقین ہے کہ مسلمان ہر دوسری قوم سے بہتر سیاسی دماغ رکھتے ہیں۔ سیاسی ذکاوت ان کے خون میں رچی ہوئی ہے۔ اسلام کی حرارت ان کے رگ و پے میں دوڑ رہی ہے۔ جب میں نے یہ محسوس کیا کہ ہمارے فیصلے چند آدمیوں کے فیصلے نہیں بلکہ یہ پوری قوم کی آواز ہیں

تو میں خوشی خوشی پیش قدمی کا حکم دوں گا۔ اگر ایسی صورت سامنے آئی تو میں خود سب سے پہلے سینہ پہ گولی کھانے کے لئے آگے بڑھوں گا۔ اس سے قبل کہ میں آگے بڑھنے کا حکم دوں میں یہ یقین حاصل کرنا چاہتا ہوں کہ دشمنوں پہ فتح پانے کے معقول امکانات موجود ہیں۔

قائداعظم کی اس تقریر کا ایک ایک لفظ جنگ کی تیاری کا بگل تھا۔ وہ اپنی ملت کو صورت حال کے تمام گوشوں سے آگاہ فرما رہے تھے۔ اور گرد وپیش کا نقشہ پوری تفصیل سے ان کے سامنے لا رہے تھے چنانچہ اس کے بعد انھوں نے یہ تفصیل بھی پیش کی کہ:-

(گذشتہ) ستمبر تک انگلستان ہٹلر کے مقابلہ کے لئے تیار نہیں تھا اس نے آسٹریا اور چیکوسلاویکیا کو قربان کر دیا۔ مسٹر چیمبرلین کو ہٹلر کی خوشامد کے لئے میونچ جانا پڑا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس وقت برطانیہ ایک طاقتور سلطنت نہیں تھی؟ کیا اس وقت برطانوی بیڑہ اور فوج طاقتور نہیں تھے؟ مسٹر چیمبرلین نے اس وقت جنگ سے جان کیوں بچائی؟ وجہ صرف یہ تھی کہ انہوں نے اس وقت یہ محسوس کیا کہ وہ پوری طرح تیار نہیں۔ اسی طرح جب مجھے یہ یقین ہو جائے گا کہ مسلمان جنگ کے لئے تیار ہیں تو میں بلاتامل انہیں آگے بڑھنے کا حکم دوں گا۔ اور جو کوئی اس وقت غداری کرے گا وہ اس کا سزاوار ہوگا کہ اُسے گولی ماردی جائے۔

مہاتما گاندھی بھی باوجود اپنی اس قدر طاقتور تنظیم، غیر محدود وسائل اور سرمایہ کی تائید کے سول نافرمانی کے لئے برابر پس و پیش کر رہے ہیں۔ اسی وجہ سے کہ وہ تیار نہیں۔ اور تیاری کر رہے ہیں مسلمانوں سے میرا مشورہ بھی یہی ہے کہ ——— آؤ ہم بھی تیار ہو جائیں ———

تیاری کا بگل بج چکا تھا۔ قوم کے محبوب قائد نے تیاری کے لئے ملک گیر اپیل کر دی تھی اور اب ملت ایک اہم اور تاریخی جدوجہد کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ اس دوران میں عاملہ مسلم لیگ کے فیصلوں کی توثیق کے لئے ۲۲ فروری ۱۹۴۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس منعقد ہوا۔ کونسل کے اس اہم اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے سب سے پہلے قائداعظم نے مجلس عاملہ کے فیصلوں کا پس منظر پیش کیا اور ان مطالبات کی تفصیل بیان کی جو جنگ عظیم سے پیدا شدہ صورت حال کی روشنی میں حکومت کے سامنے لائے گئے۔

## لیگ کونسل سے خطاب

مسلمانوں کی واحد نمائندہ اور بااختیار جماعت کی حیثیت سے مسلم لیگ سے متعلق مجلس عاملہ کی قرارداد کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:-

ایک اور مطالبہ یہ تھا کہ عبوری دور کے لئے کسی پارٹی کے دباؤ یا دھمکی سے مرعوب ہو کر، خواہ وہ کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہو، نہ تو مسلم لیگ کی رضامندی حاصل کئے بغیر کوئی سمجھوتہ کیا جائے گا اور نہ مسلم لیگ کسی اعلان یا آئین کو قانونی صورت دینے سے اتفاق کرے گی تاآنکہ اُس کی منظوری نہ لی جائے۔ اس

معاملہ میں وائسرائے نے پورا اطمینان دلایا ہے کہ وہ مسلمانوں کی اہمیت کو اچھی طرح محسوس کر رہے ہیں اور کسی ایسے سمجھوتے کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا جس میں مسلمانوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ یہ بیان ناقابل اطمینان ہے۔ اس نے مسلمانوں کو صرف صلاح و مشورہ کی منزل عطا کی ہے اور مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ ان کے مستقبل کا فیصلہ ان کے اپنے ہاتھوں میں ہو۔

کانگرسی وزارتوں نے اپنے زیر اقتدار صوبوں میں مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے ان کی تحقیقات کے سلسلے میں کانگرس نے سر مورس گائر (چیف جسٹس آف انڈیا) کی صدارت میں ایک جوڈیشل عدالت قائم کرنے کی پیشکش کی تھی۔ قائداعظم نے بدلائل اس تجویز کو لغو قرار دیا اور اس پر آمادگی ظاہر کی کہ اس کے لئے ایک رائل کمیشن مقرر ہو جس میں انگلستان کے ہائی کورٹ کے دو جج شامل ہوں۔ اور اس کی صدارت پریوی کونسل کا کوئی لارڈ کرے۔ لیگ کونسل میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے مجلس عاملہ کے اس مطالبہ کی بھی وضاحت کی۔ اور پھر فرمایا:-

عدالت ایسی ہی ہو سکتی ہے جو ملک کے زہریلے ماحول سے بالاتر ہو اور گواہوں کے بیانات اور حلف لینے اور ہر قسم کے وہ کاغذات طلب کرنے کے اختیارات سے مسلح ہو جن کی انصاف کرنے کے لئے ضرورت ہو۔ مگر کانگرس نے اس تجویز کا یہ کہہ کر مضحکہ اڑایا کہ ہم اپنے خانگی امور میں غیر ملک سے امداد طلب کر رہے ہیں۔ گویا سر مورس گائر جن کا نام کانگرس نے تجویز کیا ہے وہ بالکل سودیشی ہیں۔ اور وارد دھا یا شیو گاؤں میں پیدا ہوئے ہیں۔

## منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی

قائداعظم نے لیگ کونسل میں اپنے اس خطاب کا اختتام ملت اسلامیہ کے واحد نمائندہ زعیم کے پروقار انداز سے کیا۔ اس میں دشمنوں کے لئے ایک زوردار انتباہ بھی تھا اور اپنوں کے لئے ایک موثر اور عمل پیرا انداز اپیل بھی انہوں نے خاتمہ کلام پر فرمایا:-

لوگ پوچھتے ہیں کہ ہمارا مطمح نظر کیا ہے؟ اگر تم اب بھی یہ نہیں سمجھے ہو کہ ہمارا مطمح نظر کیا ہے۔ تو تم کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ یہ تمام مسئلہ بڑا سادہ ہے۔ برطانیہ عظمیٰ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتی ہے مسٹر گاندھی اور ان کی کانگرس بھی ہندوستان کے حکمران بننا چاہتے ہیں۔ ہمارا نصب العین یہ ہے کہ ہم نہ تو برطانیہ کو مسلمانوں پر حکومت کرنے دیں گے اور نہ مسٹر گاندھی اور کانگرس کو۔ ہم اپنے لئے آزادی اور خود مختاری کے طالب ہیں۔ میں مسلمانوں سے یہ کہتا ہوں کہ اس مقصد عظیم کے لئے اپنے آپ کو منظم کرو۔ اور مسلم لیگ کا پیغام ہر مسلمان تک پہنچا دو۔

قافلہ سالار نے تیاری کا بگل بجا دیا اور کاروانِ ملت ذوقِ سفر کے نئے ولولوں سے سرشار ہو کر سامانِ سفر باندھنے لگا۔ زندگی کی ایک عظیم ترین منزل اب اس کے قدم لینے کو آگے بڑھتی ہے۔ اس منزلِ مراد سے آزادی اور استقلال کی انقلاب آفرین کامرانیاں اور فائدہ افزائیاں وابستہ ہیں۔ اور ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس مقام پر کچھ دیر کے لئے رک جائیں۔ ہماری تاریخ کا یہ ایک انتہائی مبارک اور کامیاب سفر ہے اور قوموں کی زندگی میں ایسے انوکھے سفر جو خوش نصیبیوں کے آئینہ دار اور سرمایۂ نازش و افتخار ہوں بار بار درپیش نہیں ہوتے۔ ہم نے ان صفحات میں تحریکِ پاکستان کا پس منظر پیش کرتے ہوئے عظیم قافلہ سالار کے اُس حُسنِ تدبر کی تصویر پیش کی ہے جو اپنے کاروانِ شوق کو دشمنوں کی یلغار سے بچاتا اور کٹھن راہوں کے نشیب و فراز کو پائے استقلال سے روندتا اس حسین منزل کے آغاز تک لے آیا۔ بظاہر یہ تین سال کی مختصر مدت کا سفر تھا۔ لیکن اس تھوڑی سی مدت میں ہم جو طے کر آئے وہ کالے کوسوں کی راہ تھی۔ آغازِ سفر مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں کے حصار میں تھا جو ہماری خود مختاری کے سامنے میں ہمارے دشمن اقتدار سے مسلح ہو کر نہ صرف آگے بڑھ آئے تھے بلکہ ہمارے ذوقِ سفر کو شکست دینے کے لئے انہوں نے تابڑ توڑ حملے بھی شروع کر دیئے تھے۔ لیکن قافلہ سالار کی آواز بجلی کا وہ کڑکا بن کر فضائے سیاست میں مرتعش ہوئی جس نے حریفوں کے اوسان خطا کر دیئے۔ ان کی فتح مندیوں کی بساط اُلٹ کر رہ گئی۔ اور ان کے حربوں کو ناکام بنا دیا گیا۔

یہ ہے ہمارا تین سال کا کامیاب سفر جسے کامرانیوں کے اعتبار سے ایک صدی کی منزل تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ یہ ہے تحریکِ پاکستان کا وہ دلچسپ منظر جس کی پہنائیوں میں ہماری نشاۃِ ثانیہ کی حیات آفریں داستانیں کروٹ لے رہی تھیں۔ اسی کا نام اب تحریکِ پاکستان کا حرفِ آغاز بنتا ہے۔ اسی دورانِ سحر سے آزادی و استقلال کی صبحِ بہار دامنِ شب سے مسکراتی ہوئی منظرِ عام پر آئے گی۔

محمد علی جناح! ملتِ اسلامیہ کے قائدِ اعظم!! تم پر ملت کا سلام ہو کہ تمہاری نادرِ روزگار قیادت نے اس جوکھم جنگ کو قابلِ رشک فراست اور بلند حوصلگی سے لڑا اور اپنی ملتِ مرحومہ کو نئے عزائم اور نئے ولولوں سے مسلح کر کے اس کا رخ آزادی اور استقلال کی منزلِ مقصود کی طرف پھیر دیا۔

طلوعِ اسلام کی آئندہ اشاعت تحریکِ استقلالِ پاکستان کی انہی لازوال فتح مندیوں کی تفصیل پیش کرے گی۔

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو
تھرتھراتا ہے جہانِ چار سُو و رنگ و بو

ضربِ پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش
حاکمیت کا بتِ سنگیں دل و آئینہ رو

(اقبالؒ)

## عصرِ حاضر کی بے مثال تصنیف

# انسان نے کیا سوچا؟

## از ——— پرویز

## پاکستان کے ممتاز جرائد کا خراجِ تحسین!

"فاضل مصنف چوہدری غلام احمد پرویز کی یہ تصنیف صرف علماء و محققین ہی کے لئے قابلِ مطالعہ نہیں بلکہ اندازِ تحریر ایسا سلجھا ہوا ہے کہ اس کی افادیت اور مقصدیت کے پیشِ نظر کالجوں کے طلباء کے لئے اس کا مطالعہ زیادہ سے زیادہ وسیع ہونا چاہیے اس طرح ان کی معلومات میں وسعت کے علاوہ ان کے قلب و نظر میں اسلام اور دینِ حق سے قرب پیدا ہوگا۔"

(روزنامہ نوائے وقت لاہور)

مصنف نے نہایت جامع اور بھرپور انداز میں مفکرینِ عالم کے خیالات کو ترتیب دے کر ایک واضح تصویر پیش کی ہے یہ کتاب نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے اور انہیں اس گمراہی سے بچانے کی کامیاب سعی کرتی ہے جو مغربی مفکرین کے افکار سے نوجوانوں کے اذہان میں پیدا ہو رہی ہے۔ چار سو صفحات کی یہ کتاب ہزاروں کتابوں کا نچوڑ ہے اور فاضل مصنف کے تبحرِ علمی کا ثبوت۔

(ہفت روزہ "قندیل" لاہور)

ٹائپ کی حسین طباعت ——— سفید کاغذ ——— جلد مضبوط ——— گرد پوش سے مزین

قیمت ——— بارہ ۱۲ روپے

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام لاہور

ملنے کا پتہ:- **مکتبہ طلوعِ اسلام**

۲۶-بی - شاہ عالم مارکیٹ - لاہور

# نابینائی

(نوشتہ ۱۹۲۷ء)

علامہ اسلم جیراجپوری اپنے اس مقالہ کے شروع میں (جسے انھوں نے ۱۹۲۷ء میں لکھا تھا) نابینائی کی وجہ سے پیدا ہونے والی مشکلات کے تذکرہ کے بعد لکھتے ہیں۔

بعض علماء نے اندھوں کو ناقص الدین قرار دیا ہے کیونکہ طہارت جو اصل الاصول ہے اس کی پوری رعایت کرنے سے وہ قاصر ہیں۔ اسی بنا پر بعضوں کے نزدیک ان کی امامت بھی مکروہ ہے ان لوگوں کا استدلال اس آیت سے ہے۔

لا یستوی الاعمیٰ والبصیر ولا الظلمات ولا النور۔ ولا الظل ولا الحرور۔ "نابینا اور بینا برابر نہیں۔ اور نہ ظلمت اور نور اور نہ سایہ اور دھوپ"۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں نہ اعمیٰ سے مراد اندھا ہے نہ بصیر سے بینا۔ بلکہ کافر اور مومن ہیں اور یہی نہیں بلکہ قرآن میں دوسرے مواقع پر بھی انہیں معنوں میں یہ الفاظ مستعمل ہوئے ہیں۔ سورہ ہود میں ہے

مثل الفریقین کالاعمیٰ والاصم والبصیر والسمیع "دونوں فریقوں (کافروں اور مومنوں) کی مثال ایسی ہے جیسے اندھا اور بہرا اور بینا اور شنوا"۔

سورہ حج میں بھی فرمایا۔

فانھا لا تعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور "حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں نہیں اندھی ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں"۔

اس لئے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ ایک غیر اختیاری معذوری کی وجہ سے کیوں انسان کا مذہب رب شکور و غفور کے نزدیک فروتر ہو جائے گا۔

جن لوگوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اندھا نبی نہیں ہو سکتا ان کا نقطۂ نظر اور ہے یعنی وہ اس معذوری کو نبوت کے فرائض سے خارج سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک جہاں اور بہت سی باتیں ہیں مثلاً بدشکل یا بدخاندان ہونا جن سے ساحت نبوت پاک رہنا چاہیے وہاں نابینائی بھی ہے مگر سارے اہل علم ان کے ہم خیال نہیں ہیں۔ علامہ ابو العباس احمد بن علی نے اپنی کتاب راس مال الندیم

ہیں لکھا ہے کہ حضرت شعیب اور اسحاق علیہم السلام کی بینائی چلی گئی تھی۔ امام ابن جوزی نے تلقیح[1] میں ان دونوں ناموں کے ساتھ حضرت یعقوبؑ کا نام بھی اضافہ کیا ہے جن کی آنکھوں کے سفید ہو جانے کا ذکر قرآن میں بھی موجود ہے۔

گو اس کا جواب مخالفین کی طرف سے یہ ہے کہ پہلے دو نبیوں کے متعلق کوئی قطعی شہادت موجود نہیں ہے اور حضرت یعقوبؑ کی نابینائی عارضی تھی لیکن تاہم ان کے بیان سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ نابینائی کو ایک نقص سمجھتے ہیں نہ کہ عیب۔ تعجب ان لوگوں پر ہے جو اس کو نہ صرف عیب بلکہ عذاب قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے دعوے کی تائید میں یہ آیت پیش کرتے ہیں۔

ومن عان هذه اعمى فهو فى الاخرة اعمى "اور جو یہاں اندھا ہے۔ وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا"

لہٰذا جب آخرت میں نابینائی عذاب ہے تو دنیا میں کیوں نہیں۔

مگر حضرت ابن عباسؓ، مجاہد اور مقاتل وغیرہ اکثر علماء تفسیر نے اس کے معنی بیان کئے ہیں کہ اعمیٰ عن الحجت۔ یعنی قیامت کے دن اس کو کوئی جواب نہ سوجھے گا۔ یہ مفہوم دوسری آیت سے جو سورۂ طٰہٰ میں ہے زیادہ صاف ہو جاتا ہے۔

ومن اعرض عن ذكرى فان له معيشة ضنكا ونحشره يوم القيامة اعمى۔ قال رب لما حشرتنى اعمى وقد كنت بصيرا قال كذلك اتتك اياتنا فنسيتها وكذلك اليوم تنسى "جو کوئی میرے ذکر (قرآن) سے روگردانی کرے گا اس کے لئے معیشت تنگ ہوگی۔ اور ہم قیامت کے دن اس کو اندھا اٹھائیں گے وہ کہے گا اے میرے رب مجھے اندھا کیوں اٹھایا میں تو بینا تھا۔ وہ جواب دے گا کہ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا میری آیتیں تیرے پاس آئیں تو نے ان کو بھلا دیا اسی طرح آج تو بھلا دیا جائے گا۔

یعنی اس کے اندھا اٹھانے کا مطلب نسیان حجت ہے کہ وہ جواب دے کر اپنی برأت نہیں کر سکے گا اور نجات کی صورت نہیں دیکھ پائے گا جیسا کہ آیت کے آخری حصہ سے تشریح ہوتی ہے۔

اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ اگر یہاں اعمیٰ کا مجازی مفہوم یعنی نسیان دلائل مراد ہے تو اس سے دنیا میں اس کو کیا ضرر تھا جو آخرت میں یہ اس کے لئے تعزیر بن سکے۔

امام رازیؒ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ چونکہ اس کی روح نے جہالت میں دنیا سے مفارقت کی اس لئے یہی جہالت اس کی روح کے لئے الم کا باعث ہوگی۔

---

[1] یہ نادر و نایاب کتاب جس سے دنیا کے بڑے بڑے شاہی کتب خانے خالی تھے۔ حال ہی میں ہمارے دوست مولوی محمد یوسف صاحب ٹونکی کی کوشش سے دہلی میں طبع ہوئی ہے۔

اس جواب سے افسوس ہے کہ امام صاحب کے روحانی معارف کے قائل ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا سیدھا جواب یہ ہے جو شخص دنیا میں قرآن سے روگرداں ہوا وہ قیامت میں اندھوں کی طرح سرگرداں پھرے گا اور کوئی سبیل نجات کی نہیں دیکھ پائے گا۔

گو یہ آیت عمل بالقرآن کے متعلق ہے لیکن بعض علماء نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اگر کوئی شخص حفظ کرنے کے بعد قرآن کو بھلا دے تو وہ قیامت کے دن اندھا اٹھایا جائے گا۔

حاصل یہ ہے کہ نابینائی اگرچہ ایک دردناک مصیبت ہے لیکن وہ عذاب یا تعزیر کسی طرح پر نہیں کہی جا سکتی۔ ہزاروں بچے مادر زاد اندھے پیدا ہوتے ہیں آخر کس جرم کی تعزیر میں؟

بے بصری سے ہر چند انسان میں بڑا نقص آجاتا ہے اور اس کی زندگی تقریباً بے کار سی ہو جاتی ہے لیکن اس میں کچھ فائدہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ توجہ بٹانے والی چیزوں سے اس کو یکسوئی ہو جاتی ہے اس لئے اس کی بصیرت اور ذہانت بڑھ جاتی ہے۔ خاص کر قوت حافظہ چنانچہ خود نابینا بزرگوں کے اقوال اس پر شاہد ہیں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔

ان یاخذ اللہ من عینی نورھما ففی لسانی وسمعی منھما نور

قلبی ذکی وعقلی غیر ذی دخل وفی فمی صارم کالسیف ماثور

یعنی اگر اللہ نے میری آنکھوں کا نور لے لیا تو ان کے بدلے میں میری طاقت اور سماعت میں نور آگیا۔ یہ دل ذکی ہے اور عقل بے شائبہ۔ اور منہ میں ایسی زبان ہے جو تیغ کی طرح تیز ہے۔

وقالوا قد عمیت فقلت کلا وانی الیوم ابصر من بصیر

سواد العین زار سواد قلبی لیجتمعا علی فہم الامور

یعنی لوگوں نے کہا کہ تو اندھا ہو گیا، میں نے کہا ہرگز نہیں، اب تو میں بیناؤں سے بھی بڑھ کر بینا ہوں میری آنکھوں کی سیاہی (پتلی) سویداء قلب میں آگئی ہے تاکہ دونوں مل کر باتیں سمجھیں۔

جودت طبع میلان ذہن اور حفظ و یادداشت کے متعلق نابیناؤں کی داستانیں حیرت انگیز ہیں ایک حدیث بھی بیان کی جاتی ہے کہ

ما اخذ اللہ کریمتی مومن الاعوضہ خیرا منھما۔ "اللہ جب مومن کی آنکھیں لے لیتا ہے ان کا بدلہ ان سے بہتر اس کو دیتا ہے"۔

یہی وجہ تھی کہ ہمارے سلف اس جماعت کو حفظ قرآن و حدیث میں لگا دیتے تھے تاکہ ان کی زندگی نہ صرف ان کے بلکہ ملت کے لئے مفید اور کارآمد ہو جائے چنانچہ علمائے اسلام یعنی محدثین، مفسرین، فقہا اور ادبا، بالخصوص شعراء میں ان کی ایک جماعت کثیر نامور ہوئی۔ جن کی تصانیف اب تک بھی امت کے لئے سرمایہ ناز ہیں۔

خود عرب کی گرمی اور اس کے صحاری آنکھوں کے حق میں کچھ اچھے واقع نہیں ہوئے ہیں۔ ہمیشہ سے وہاں ایک بڑی تعداد احولوں، کانوں اور اندھوں کی رہی ہے لیکن اسلامی ممالک میں سب سے زیادہ آنکھوں کے لئے

مصر دریائے نیل کا پانی ہے ملک مصر میں تقریباً ۲۵ فی صدی آدمی آنکھوں کے بیمار رہتے ہیں وہ بیمار نہیں جس کی بابت شاعر نے کہا ہے ؎

لقب کیا کیا تمہاری چشم عاشق کش نے پائے ہیں
نشیلی، سرنگیں، بیمار، افسوں گر، بڑی، اچھی

بلکہ واقعی مریض۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کثرت سے اندھے سڑکوں پر گھومتے نظر آتے ہیں۔

ہرچند کہ بغداد کی تباہی کے بعد سے اسلامی علوم اور آداب کا مرکز قاہرہ رہا ہے اور آج تک بھی ہے لیکن وہاں کی حالت خراب ہوتے ہوتے اس درجہ تک پہنچ گئی ہے کہ ہر ہر محلہ میں ایک ایک قبر زیارت گاہ ہوتی ہے جس کے ارد گرد یہ اندھے بیٹھے ہوئے قرآن پڑھتے رہتے ہیں تاکہ زائرین سے کچھ خیرات وصول کریں۔ مردوں کے ایصال ثواب کی دعوتوں اور گورستانوں میں اکثر یہی جماعت قطار در قطار نظر آتی ہے اور اپنی دینی اور دنیاوی اور جسمانی و روحانی افسوس ناک حالت سے ایسا پُر الم نظارہ پیش کرتی ہے جس پر انسانیت ماتم کرنے لگتی ہے۔ اور اس کے مقابل میں کافر یورپ جو سلوک اپنے یہاں کے اندھوں کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کی ستائش کرنی پڑتی ہے۔

ہندوستان کے مفلس اور نادار مسلمان اس مصیبت زدہ جماعت کی تکلیف کا احساس بھی نہیں رکھتے[1]۔ ہندستان کی تاریخ بتلاتی ہے کہ انہوں نے اپنی دولت اور شوکت کے زمانہ میں بھی اس کی طرف زیادہ توجہ نہ کی اور ایک بیکار چیز دیکھا۔

اس آخری زمانہ میں نواب صدیق حسن خان صاحب نے البتہ جابجا سے اندھوں کو بھوپال میں جمع کر کے سلف کے دستور کے مطابق قرآن و حدیث یاد کرنے کے کام میں لگایا تھا اور وظائف مقرر کر دیئے تھے۔ چنانچہ ان کے عہد میں وہاں اس جماعت کی بڑی تعداد تھی۔ بالعموم یہ لوگ قرآن حفظ کر لیتے تھے جس کا اثر یہ ہوا کہ وہاں اندھوں کو عام طور پر "حافظ جی" کہنے لگے بعض بعض بلوغ المرام اور مشکوٰۃ ازبر کر لیتے تھے اور اس پر ان کو انعامات ملتے تھے۔ چند ایسے بھی تھے جو بخاری بلکہ صحاح ستہ یاد رکھتے تھے۔ انہیں میں سے کچھ لوگ صاحب درس بھی تھے جن کی ذہانت اور حافظہ کے متعلق عجیب و غریب روایتیں وہاں مشہور تھیں۔

اس ذیل میں اسلام کے مشہور نابیناؤں کا ایک اجمالی تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم میں سے جو حضرات مکفوف البصر تھے وہ یہ ہیں۔

(۱) حضرت سعد بن وقاصؓ۔ فاتح قادسیہ و مدائن۔ یہ ساتویں مسلمان اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ نیز ان چھ ارباب شوریٰ میں سے ہیں جن کو حضرت عمرؓ اپنے بعد آپس میں سے خلیفہ منتخب کرنے کے لئے نامزد فرما گئے تھے۔
یہ صحابہ کرام میں خصوصیت کے ساتھ "مستجاب الدعوات" تھے۔ زمانہ فتنہ میں سب سے الگ رہے۔ آخری عمر

---

[1] چند سال ہوئے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے اپنے والد ماجد کی یادگار میں علی گڑھ میں اندھوں کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ کھولا ہے۔ غالباً ہندوستان کے مسلمانوں میں وہ پہلی مثال ہے۔

میں بصارت جاتی رہی۔ حمراء الاسد کے متصل ان کی زمین تھی وہیں مکان بنا کر سکونت اختیار کی۔ سنہ ۵۵ھ میں انتقال فرمایا نعش کو لوگ مدینہ میں اٹھا لائے۔

(۲) حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ عم رسولؐ بڑھاپے میں نابینا ہو گئے تھے۔ حضرت عمرؓ نے استسقاء میں جب ان کو آگے بڑھایا تھا اس وقت بھی نابینا تھے۔ سنہ ۳۲ھ میں وفات پائی۔ عمر ۸۸ سال تھی۔

(۳) حضرت عبداللہ بن عباسؓ حبر امت۔ اپنے باپ اور دادا کی طرح بڑھاپے میں آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔ امیر معاویہؓ ان کی بہت عزت و توقیر کرتے تھے۔ ایک تو ان کے عقل و علم کی وجہ سے۔ دوسرے اس سبب سے کہ ان کے باپ ابوسفیانؓ اور ان کے باپ حضرت عباسؓ میں باہم بہت محبت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عبداللہ بن عباسؓ اکثر ان سے ملنے کے لئے دمشق میں جایا کرتے تھے۔ جب یہ نابینا ہو گئے تھے اس زمانہ میں امیر معاویہؓ نے ایک دن کہا کہ بنی ہاشم کی بصارت پر اکثر آفت آجاتی ہے۔ بولے کہ ہاں۔ اور بنی امیہ کی بصیرت پر۔ طائف میں رہتے تھے۔ وہیں سنہ ۶۸ھ میں گذر گئے۔

(۴) عقیل بن ابی طالبؓ۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بھائی اور انساب عرب کے بڑے واقف کار تھے۔ حضرت عمرؓ نے فوج کا دفتر جن لوگوں سے مرتب کرایا تھا ان میں یہ بھی تھے۔ جنگ صفین کے بعد اپنے بھائی کا ساتھ چھوڑ کر معاویہؓ کے پاس چلے گئے اور وہیں رہنے لگے۔

ایک روز امیر معاویہؓ نے اپنے درباریوں سے کہا کہ سورۃ تبت میں ابولہب کا نام جو آیا ہے اس کو تم لوگ جانتے ہو کہ کون تھا؟ شامیوں نے کہا کہ نہیں۔ عقیلؓ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ان کا چچا تھا۔ حضرت عقیلؓ نے ان لوگوں سے کہا کہ اسی سورۃ میں ابولہب کی بیوی جس کو حمالۃ الحطب کا خطاب دیا گیا ہے جانتے ہو کہ کون تھی؟ لوگ بولے نہیں۔ کہا کہ وہ معاویہؓ کی پھوپھی ام جمیل بنت حرب تھی۔ سنہ ۵۰ھ کے حدود میں وفات پائی۔

(۵) عبداللہ بن عمر بن خطابؓ۔ علماء اور اتقیاء صحابہ میں سے ہیں۔ باپ کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے۔ جنگ بدر اور احد میں کمسنی کی وجہ سے شرکت کی اجازت نہ پائی اور راستہ سے واپس کر دیئے گئے۔ بعد کے تمام لڑائیوں میں شریک رہے۔ فتح مصر میں بھی شامل تھے۔ اور جنگ ایران میں بھی۔ بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے بیعت رضوان میں انہوں نے ہی سبقت کی تھی لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ ابوسنان اسدی تھے۔

کبر سنی میں آنکھوں نے جواب دے دیا تھا۔ سنہ ۷۳ھ میں محاصرۂ مکہ کے زمانہ میں حجاج بن یوسف ثقفی کے کسی سپاہی کا تیر ان کے پاؤں میں لگ گیا۔ اس زخم سے جانبر نہ ہو سکے۔ حجاج بھی عیادت کے لئے حاضر ہوا۔ اور پوچھا کہ کس نے مارا؟ بولے تم جس نے حدود حرم میں لوگوں کو اسلحہ رکھنے کی اجازت دی۔

(۶) ابوسفیان صخر بن حربؓ۔ امیر معاویہؓ کے والد۔ فتح مکہ میں مسلمان ہوئے۔ طائف کے غزوہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب تھے۔ اس میں ایک آنکھ تیر سے زخمی ہوئی۔ دوسری معرکۂ یرموک میں شہید ہوئی جب کہ اپنے بیٹے یزید کے علم کے نیچے جہاد کر رہے تھے۔ مدینہ میں سنہ ۳۲ھ میں وفات پائی۔

(۷) ابو قحافہؓ حضرت ابوبکرؓ کے والد۔ فتح مکہ میں مسلمان ہوئے تھے۔ خلیفہ اول کی خصوصیت یہاں ذکر کے قابل ہے کہ ان کی چار پشتیں صحابی ہیں۔ وہ خود۔ ان کے باپ۔ اور ان کے بیٹے عبدالرحمٰن۔ اور پوتے محمد بن عبدالرحمٰن۔ اسلام لانے کے وقت ابو قحافہ کی بصارت جا چکی تھی اور تمام بال سفید ہو چکے تھے۔ تاہم وہ حضرت ابوبکرؓ کے انتقال کے وقت تک زندہ تھے۔ ۱۴ھ میں انتقال کیا۔ عمر ۹۷ سال کی تھی۔

(۸) حسان بن ثابت انصاریؓ خزرجی۔ شاعر دربارِ نبوی۔ بڑی عمر پائی۔ ساٹھ سال جاہلیت میں گذارے اور اسی قدر اسلام میں۔ ۵۴ھ میں وفات پائی۔ یہی ان کی خاندانی عمر تھی۔ امام ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ ان کے باپ اور دادا ہر ایک نے اسی قدر طویل عمریں پائی تھیں۔
جب بڑھاپے میں بینائی سے معذور ہو گئے تھے کبھی کبھی حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے اشعار سناتے۔

(۹) کعب بن مالک انصاریؓ۔ دربارِ نبوی کے دوسرے شاعر۔ جنگِ احد میں ان کے گیارہ زخم آئے تھے۔ اس کے بعد بھی تمام غزوات میں شریک رہے۔ بدر کی شرکت میں اختلاف ہے۔ قرآن کریم میں جن تین شخصوں کا ذکر ہے کہ غزوۂ تبوک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نہ گئے اور لیت ولعل میں رہ گئے ان میں سے ایک یہ بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بوجہ صدق کے ان کی توبہ قبول کر لی۔ ۵۰ھ میں مدینہ میں انتقال فرمایا۔ اس سے کچھ زمانہ پہلے آنکھیں جاتی رہی تھیں۔

(۱۰) ابن ام مکتومؓ۔ ان کا نام عمرو بن قیس ہے۔ ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے ماموں زاد بھائی ہوتے تھے۔ بصارت سے معذوری کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مدینہ میں مؤذن مقرر فرمایا تھا۔ عاقل و مدبر تھے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کہیں باہر کسی غزوہ وغیرہ کے لئے جاتے تو اکثر انہیں کو اپنا قائم مقام کر جاتے۔ جہاد کے شوق میں جنگِ قادسیہ میں جا کر شرکت کی۔ کیونکہ عرب و عجم کا سب سے بڑا مقابلہ وہی تھا۔ ایک طرف تمام عجمی شہزادے، امراء اور رؤساء تھے۔ دوسری طرف سے مدک عرب کے سارے بہترین لختِ جگر حضرت سعدؓ نے ان کو علمبردار مقرر کر دیا۔ ایک بیان یہ بھی ہے کہ وہیں شہید ہوئے لیکن اکثر مؤرخ لکھتے ہیں کہ مدینہ میں آ کر ۱۵ھ میں انتقال فرمایا۔

(۱۱) ابو اسید ساعدی انصاریؓ۔ بدر و احد، ہر غزوہ میں حاضر رہے۔ بدریین میں سے سب سے آخر میں ۶۰ھ انتقال فرمایا۔ عمر ۷۵ سال تھی۔ بڑھاپے میں آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔

(۱۲) مخرمہ بن نوفلؓ۔ سرداران قریش میں سے تھے۔ فتح مکہ کے دن اسلام لائے۔ اور جنگِ حنین میں رسول اللہ کے ہمرکاب شریک ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے دفتر فوج کی ترتیب میں ان سے بھی مدد لی۔ کیونکہ انساب اور قبائلِ عرب سے خوب واقف تھے۔
حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔ ۶۴ھ میں مدینہ میں انتقال کیا۔

(۱۳) براء بن عازب انصاریؓ۔ جنگِ بدر میں جا رہے تھے لیکن کمسنی کی وجہ سے راستے سے واپس کر دیئے گئے۔ ۷۲ھ

میں حاکم رہے انہیں کے ہاتھ سے فتح ہوا۔ جب آنکھیں جاتی رہیں تو کوفہ میں سکونت گزیں ہو گئے وہیں [illegible] میں وفات پائی۔

(۱۴) عبداللہ بن ارقمؓ۔ فتح مکہ میں اسلام لائے۔ آنحضرتؐ کے اور ان کے بعد شیخین کے کاتب رہے حضرت عمرؓ اور عثمانؓ کے عہد میں ایک مدت تک بیت المال ان کے سپرد رہا، آخر میں نابینا ہو گئے تھے [illegible] کے حدود میں گذر گئے۔ حضرت عثمانؓ نے ایک بار ان کو تیس ہزار درہم انعام میں عطا کئے لیکن لینے سے انکار کر دیا۔

(۱۵) عبداللہ بن علقمہ اسلمیؓ۔ بیعت رضوان نیز دیگر غزوات میں بھی شریک رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مدینہ چھوڑ دیا، جب کوفہ آباد ہوا تو وہاں سکونت اختیار کر لی۔ بڑی عمر پائی، بڑھاپے میں آنکھیں جاتی رہیں کوفہ میں سب سے آخری صحابیؓ یہی رہ گئے تھے ۸۷ھ میں انتقال فرمایا۔

(۱۶) عتبہ بن مسعود ہذلیؓ۔ دونوں ہجرتوں میں شریک تھے۔ اور کسی غزوہ سے غیر حاضر نہ ہوئے۔ مدینہ میں انتقال کیا۔ حضرت عمرؓ نے جنازہ کی نماز پڑھائی، گو عمر زیادہ نہ پائی لیکن آنکھوں نے جواب دے دیا تھا۔

(۱۷) امیہ بن الاسکر کنانیؓ۔ زمانہ جاہلیت میں اپنے قبیلہ بنی لیث کے سردار تھے۔ اسلام لا کر مدینہ میں رہ گئے۔ آنکھوں سے معذور تھے۔ ان کے ایک ہی بیٹا تھا کلاب۔ جہاد کے شوق میں اس نے ابو موسیٰ اشعریؓ کی فوج میں اپنا نام لکھا لیا، اور عراق کو چلا گیا۔ اس عمر میں اور خاص کر بڑھاپے میں نابینا باپ کو فرمانبردار اور خدمت گزار بیٹے کے چلے جانے سے بڑی بے قراری ہوئی۔ خلیفہ وقت حضرت عمرؓ کے پاس آ کر روئے اور درخواست کی کہ کلاب کو واپس بلا دیجئے۔ چند اشعار بھی ان کو سنائے جو اس قدر دردناک تھے کہ حضرت عمرؓ آبدیدہ ہو گئے۔ آخر میں یہ دھمکی بھی تھی کہ اگر نہ بلایا تو بددعا کروں گا۔ حضرت عمرؓ نے ابو موسیٰ کو فوراً حکم بھیجا کہ کلاب کو واپس کر دو۔ جب وہ آئے تو پہلے خلیفہ ہی کے پاس حاضر ہوئے، انہوں نے پوچھا کہ تم اپنے باپ کی کیا خدمت کرتے تھے کہ وہ تمہارے لئے اس قدر بے تاب ہیں۔ کہا کہ میں ہی ان کے سارے کاموں کا کفیل تھا اور جب وہ پینے کے لئے دودھ مانگتے تھے تو سب سے بہتر اونٹنی کو منتخب کر کے اس کے تھن کو پانی سے دھوتا تاکہ دودھ ٹھنڈا ہو جائے پھر نکال کر لاتا اور پلاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے امیہ کو بلایا اور پوچھا کہ کیا حال ہے؟ بولے کہ یہی آرزو ہے کہ کلاب کو پاؤں، سینہ سے لگاؤں، اور سونگھوں[1]۔

حضرت عمرؓ نے کلاب کو اشارہ کیا۔ وہ اسی طرح اونٹنی کا دودھ نکال کر لائے جس طریقہ سے نکالا کرتے تھے۔ جس وقت اس کو امیہ کے ہاتھ میں دیا۔ اور انہوں نے منہ سے لگایا تو کہا کہ واللہ اس پیالہ سے مجھے کلاب کے ہاتھوں کی مہک آتی ہے۔ فرط رقت سے حضرت عمرؓ اور

[1] عرب اپنے بچوں کو سونگھتے تھے، یہی وجہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کو اپنی ریحانہ فرمایا ہے۔

حاضرین کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ پھر انھوں نے کلاب کو بلا دیا۔ وہ پلٹ گئے اور بیٹے کو لے کر گھر آئے۔ حضرت عمرؓ نے کلاب سے کہا کہ تم اپنے والدین کی خدمت ہی کو جہاد سمجھو۔ چنانچہ ان دونوں کی زندگی تک وہ کسی جنگ میں شامل نہ ہوسکے۔

صحابہ کرام میں سے صرف انھیں حضرات کے حالات ملے یقیناً اور لوگ بھی ہوں گے مگر ہم نے استیعاب کی کوشش بھی نہیں کی۔

زمانہ مابعد میں تاریخ اسلام میں نابیناؤں کی ایک کثیر تعداد ملتی ہے مگر ان میں سے بادشاہوں، شاہزادوں امراء اور وزراء کے حالات میں کوئی خاص دل کشی نظر نہیں آتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اندھا ہونے یا کر دیئے جانے کے بعد اس گروہ کو اپنی گزشتہ عزت و شوکت اور دولت و راحت کا اس قدر رنج و غم رہتا تھا کہ ساری انسانی خوبیاں اور طبیعی لطافتیں جاتی رہتی تھیں اور خوش مزاجی ان کے پاس بھی نہیں پھٹکتی تھی۔ اس لئے ان کے خشک تذکرہ کو چھوڑ دینا پڑا۔

مفسرین و محدثین، علماء و فقہاء، مصنفین و مؤلفین اور ادباء و شعراء کا بھی بڑا گروہ ہے لیکن ان میں سے ہم صرف ان بعض کے حالات لکھتے ہیں جن کی زندگی میں کوئی تاریخی دلچسپی یا ادبی لطافت ہے۔

(۱) عبدالصمد بن علی۔ ان کے باپ، دادا، پردادا، اور سکڑ دادا سب آخر میں نابینا ہو گئے تھے پھر یہ کیسے بچتے۔ ان کی تاریخ اعجوبۂ روزگار ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ان کی ولادت اور ان کے بھائی محمد بن علی اولین خلیفۂ عباسی سفاح کے باپ کی ولادت میں پورے ۴۴ سال کا فصل ہے یہ سنہ ۱۰۴ھ میں اور محمد مذکور سنہ ۶۰ھ میں۔ پھر محمد نے سنہ ۱۲۶ھ میں وفات پائی اور عبدالصمد نے سنہ ۱۸۵ھ میں۔ دونوں کی وفات میں ۵۹ سال کا فرق ہے۔ اس قدر بعد زمانی ایک ہی باپ کی دو اولاد میں مشکل سے مل سکتا ہے دوسرا امر یہ ہے کہ یزید بن معاویہ سنہ ۵۰ھ میں امیر الحج تھا اور عبدالصمد سنہ ۱۵۰ھ میں۔ حالانکہ دونوں عبد مناف سے ایک ہی درجہ میں پڑتے ہیں یعنی یزید بن معاویہ بن ابی سفیان بن حرب بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف۔ اور عبدالصمد بن علی بن عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف۔

تیسری بات یہ ہے کہ پانچ عباسی خلفاء سفاح منصور۔ مہدی۔ ہادی اور ہارون الرشید کے زمانے دیکھے چنانچہ ایک بار ہارون کے دربار میں عجیب اجتماع تھا۔ خلیفہ کا چچا سلیمان موجود تھا۔ اور سلیمان کا چچا عباس اور عباس کے چچا عبدالصمد تھے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ خلاف معمول ان کے دودھ کے دانت آخر عمر تک سے دوسرے دانت نہیں نکلے۔

مہدی اور ہارون کے زمانوں میں دمشق اور مکہ وغیرہ مختلف امارتوں کے عہدوں پر رہے۔ بنی عباس میں ان کا خاص احترام تھا۔ بصرہ میں انتقال کیا۔

(۲) قتادہ بن دعامہ۔ حفظ میں ضرب المثل تھے۔ جو بات سن لی کبھی نہ بھولے۔ روایت حدیث میں کسی شخص سے کبھی یہ نہ کہا کہ دوبارہ فرمائیے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے ان کی بہت مدح لکھی ہے اور تفسیر اور اختلاف علماء کا عالم اور فقیہ و حافظ حدیث تسلیم کیا ہے۔ ان کے حافظہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ میں نے ایک بار صحیفۂ جابر ان کے سامنے پڑھا وہ سارے کا سارا ان کو ازبر ہو گیا۔ یہ ائمہ تابعین مثلاً سعید بن المسیب اور امام شعبی وغیرہ کے شاگرد تھے۔ ان سے کئی ارباب صحاح ستہ نے روایات لی ہیں۔ سنہ ۱۱۷ھ میں انتقال فرمایا۔ آنکھیں ایام طفلی ہی میں جا چکی تھیں۔

(۳) محمد بن حازم ابو معاویہ۔ سنہ ۱۱۳ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ چار سال کی عمر میں بینائی سے محروم ہو گئے۔ امام اعمشؒ کے پاس بیس سال رہے اور انہیں سے علم حدیث اخذ کیا۔ ہشام بن عروہ سے بھی روایت کرتے ہیں۔ ائمہ حدیث مثلاً امام احمد بن حنبلؒ اور یحییٰ بن معین وغیرہ نے ان سے روایت کی ہے۔ حافظ حدیث اور ثقہ تھے۔ اور بغداد میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ سنہ ۱۹۵ھ میں وفات پائی۔

(۴) ابو الحسن منصور بن اسماعیل ضریر۔ امام شافعی کے شاگرد ان خاص میں تھے۔ متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اہل مصر ان کا بہت احترام کرتے تھے۔
ایک بار وہاں سخت قحط پڑا۔ فاقہ سے تنگ آکر انہوں نے اپنی چھت پر کھڑے ہو کر پکارا کہ لوگو! میری مدد کرو۔ تھوڑی دیر میں ان کے دروازہ پر سینکڑوں اونٹ غلہ سے لدے ہوئے آگئے۔
شعر بھی کہتے تھے۔ نہایت لطیف اور حکیمانہ۔
پہلے فوج میں ملازم تھے جب بصارت سے معذور ہو گئے تو تفقہ اختیار کیا۔ سنہ ۳۰۶ھ میں مصر میں گذر گئے۔

(۵) محمد بن ہذیل علاف بصری معتزلی جماعت متکلمین میں ممتاز اور ان کے ایک گروہ کا جو انہی کی نسبت سے ہذلی بولے جاتے ہیں امام ہے۔
مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے کہ آخر عمر میں اس کی بصارت اور اس کے ساتھ بصیرت بھی جاتی رہی لوگ کہتے تھے کہ سٹھیا گیا ہے۔ سنہ ۲۲۶ھ میں مر گیا۔

(۶) عبداللہ بن محمد شافعی۔ سلطان نورالدین زنگی شہید نیز سلطان صلاح الدین ایوبی، دونوں کے درباروں میں بڑی عزت رکھتے تھے اور چونکہ یہ دونوں شافعی تھے اس وجہ سے امام مذکور ان کے عہد میں صاحب فتویٰ اور قاضی القضاۃ تھے۔ متعدد تصانیف چھوڑی ہیں، جو شافعیہ میں مقبول ہیں۔ سنہ ۵۸۵ھ میں مرے۔
آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔ اس وقت ایک رسالہ اس امر کے اثبات میں لکھا کہ اندھا شخص قاضی ہو سکتا ہے چنانچہ سلطان صلاح الدین نے انہیں کے فتوے کے مطابق ان کو ان کے منصب پہ بحال رہنے دیا۔ لیکن

دوسرے لوگوں نے اس مسئلہ میں ان سے اختلاف کیا ہے اور عام طور پر اہل علم اسی بات کے قائل ہیں کہ نابینا کو قاضی نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ وہ فریقین نیز گواہوں کی شناخت میں غلطی کر سکتا ہے۔

(۷) شافع بن علی بن عباس بن اسماعیل بن عساکر عسقلانی۔ دیار مصریہ کے میر منشی اور علم و ادب میں صاحب کمال تھے۔ صلاح الدین صفدی نے تاریخ اور علوم عربیہ میں ان کی تقریباً ۲۰ تصنیفات نام بنام گنائی ہیں۔ ایک دیوان شعر بھی ہے۔

جنگ حمص میں کان کی جڑ میں ایک تیر لگا تھا۔ اسی سے آنکھیں جاتی رہیں۔ اس کے بعد سے خانہ نشین ہو گئے کتابوں کے بڑے شائق تھے۔ ۱۸ المارياں اُن سے بھری ہوئی رکھتے تھے اور اپنے مصاحبین اور شاگردوں سے پڑھوا کر سُنا کرتے تھے جب ان میں سے کوئی کتاب ہاتھ میں لیتے تو بتا دیتے کہ یہ فلاں کتاب ہے جو فلاں زمانے میں میں نے فلاں شخص سے اس قیمت پر خریدی تھی۔ سنہ ۷۳۰ھ میں انتقال کیا۔

(۸) علی بن احمد آمدی۔ یہ بھی بڑے ادیب۔ فاضل اور کتب کے عاشق تھے۔ اور فن تعبیر خواب کے امام جواہر التبصیر فی العلم التعبیر اُن کی مشہور تصنیف ہے، کتابوں کی تجارت کرتے تھے اور اپنے کتب خانہ کے ایک ایک نسخہ سے واقف تھے جب ضرورت پڑتی تو خود نکال کر لاتے اگر کسی کتاب کی متعدد جلدیں ہوتیں اور ایک خاص جلد درکار ہوتی تو اسی پر ان کا ہاتھ پڑتا تھا۔

ہلاکو خاں کا پڑپوتا سلطان غازان خاں جو مسلمان ہو گیا تھا جب بغداد میں مدرسہ مستنصریہ کو دیکھنے کے لئے آنے والا تھا تو اس کی خوب آرائش کی گئی تھی۔ علماء اپنے اپنے مسندوں پر بیٹھے تھے۔ اعیان و اکابر بغداد بھی سلطان کے استقبال کے لئے بلائے گئے تھے جن میں علی آمدی بھی تھے۔

جب سلطان آیا تو اس کے ساتھ کے مغول امراء سب ان سے مصافحہ کرتے گذرنے لگے لیکن یہ کسی کے لئے تعظیماً کھڑے نہیں ہوئے مگر جس وقت سلطان نے ہاتھ ملایا تو پتا چلتے ہوئے سرو قد کھڑے ہو گئے اور ترکی فارسی اور عربی زبانوں میں اس کو دعائیں دیں۔ اس کو ان کی فراست اور لیاقت پر تعجب ہوا، اور یہ معلوم کر کے اور بھی خوش ہوا کہ یہ رومی زبان بھی بے تکلف بولتے ہیں خلعت اور انعام عطا فرمایا اور تین سو درہم ماہانہ گزارہ کے لئے مقرر کر دیا۔ بغداد کے علماء اور رؤسا نیز خوانین مغول سب ان کی عزت کرتے تھے۔ باوجود فراغت کے بھی یہ دن رات اپنے تجارتی مشاغل میں مصروف رہتے تھے۔ سنہ ۷۱۲ھ میں فوت ہوئے۔

(۹) یعقوب بن داؤد خلیفہ مہدی کا مشہور وزیر جو وزارت نہیں بلکہ خلافت کرتا تھا۔ دشمنوں نے مہدی کے کان میں پھونک دیا کہ یہ علویہ کی طرف میلان رکھتا ہے۔ اس نے اس کو ایک حسین و جمیل کنیز عطا کی جس کو نہایت خوش ہو کر یہ لیتے گھر لے آیا۔ دوسرے دن جب دربار میں گیا تو مہدی نے تنہائی میں لے جا کر کہا کہ

میرا ایک ضروری کام ہے وہ کر دو۔ اس نے کہا کہ میں تو حضور کا غلام ہوں جو حکم ہوگا بجا لاؤں گا۔ کہا کہ تمہیں میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ۔ اس نے قسم کھائی۔ فرمایا کہ فلاں علوی کی طرف سے مجھے خطرہ ہے میں چاہتا ہوں کہ تم اس کا خاتمہ کر دو۔ بولا کہ یہ کون سی بڑی بات ہے۔ اپنے گھر آ کر رات کو اس علوی کو دبایا اور کہا کہ میں تم کو قتل کروں گا۔ اس نے جواب دیا کہ میں بے بس ہوں اور آپ صاحب اختیار۔ جو چاہیں کر سکتے ہیں لیکن یہ سوچ لیجئے کہ رسول اللہ کی اولاد کا خون کر کے قیامت میں اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے۔

یعقوب پر اس بات کا اثر ہوا۔ اس نے کہا کہ اچھا مناسب یہ ہے کہ تم راتوں رات یہاں سے غائب ہو جاؤ، تاکہ خلیفہ کو میں مطمئن کر سکوں۔ وہ علوی نکل گیا۔ ادھر کنیز نے فوراً خلیفہ کو پرچہ بھیج کر اس کیفیت سے آگاہ کیا۔ اس نے سوار دوڑائے جو علوی کو گرفتار کر لائے اور محل کے ایک حجرہ میں بند کر دیا۔

صبح کو حسب معمول جب وزیر یعقوب وہاں پہنچا تو خلیفہ نے اس سے پوچھا کہ تم نے کیا کیا؟ کہا حکم کی تعمیل کر دی۔ بولا کہ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ۔ اس نے یہ بھی کیا۔ مہدی نے اشارہ کیا۔ خدام نے علوی کو سامنے لا کر کھڑا کر دیا یعقوب مبہوت رہ گیا۔ مہدی نے کہا کہ اب تمہارا خون میرے لئے حلال ہے لیکن مجھے قتل کی عادت نہیں ہے اس لئے حکم دیتا ہوں کہ تم قید خانے میں قید کر دیئے جاؤ۔

پندرہ سال تک یعقوب ایک قید خانے میں بند رہا۔ بینائی جاتی رہی۔ اس کے بعد ہارون کے عہد میں اس کے حکم سے آزاد کیا گیا۔ جب دربار میں سلام کے لئے حاضر ہوا تو ہارون نے کہا۔ کہ میں نے اپنے ایک بچہ کو کل گود میں اٹھایا تھا اس وقت مجھ کو یاد آگیا کہ بچپن میں تم مجھ کو اسی طرح گود میں کھلایا کرتے تھے اس لئے میں نے تم کو رہا کیا۔ اب تمہارا گذارہ مقرر کرتا ہوں جہاں چاہو رہو۔ اس نے مکہ مکرمہ میں اقامت اختیار کی۔ وہیں ۱۸۷ھ میں گذر گیا۔

(۱۰) بشار بن برد۔ مادر زاد اندھا۔ عربی کا نامور شاعر۔ ہزاروں قصیدے لکھے۔ جن میں سے اکثر ہجو میں تھے کہا کرتا تھا کہ پہلے میں نے جریر کی ہجو کہی تھی۔ مگر اس نے کم سن سمجھ کر میری طرف توجہ نہ کی ورنہ فرزدق کی جگہ میں لیتا۔

ایک بار مہدی کی تعریف میں قصیدہ کہا۔ اس نے التفات نہ فرمایا۔ اس پر اس کی ہجو کہی۔ وزیر یعقوب بن داؤد نے خلیفہ کو سنایا وہ سخت برہم ہوا۔ چنانچہ جب بصرہ میں آیا تو بشار کو گرفتار کر کے شراب خوری کے الزام میں اس قدر پٹوایا کہ وہ تلف ہو گیا۔ یہ واقعہ ۱۶۸ھ میں ہوا۔

بشار ایک بار گلی سے نکل کر جب سڑک پر پہنچا تو کسی نے کہا ذرا رک جاؤ بڑا اژدھام ہے لوگ ایک جنازہ بڑی تیزی سے لئے جا رہے ہیں۔ بولا کہ کہیں سے چھپا کر بھاگے جاتے ہیں؟ اس کے غلام نے ایک

بارحساب پیش کیا جس میں دس درہم آئینہ کی جلا کی اجرت بھی درج تھی۔ کہنے لگا کہ عجیب!! اندھا اور آئینہ کی جلا کی اجرت!! واللہ اگر سورج بھی زنگاری ہو جائے اور اس کی صیقل کی اجرت دس درہم مجھ سے مانگی جائے تو میں نہیں دوں گا۔

(۱۱) ابن علاف مزینہ شاعر۔ خلیفہ معتضد کا ندیم تھا۔ اس نے ایک بلی پالی تھی جو ہمسایوں کے کبوتر کھا جاتی تھی۔ ایک دن کسی نے اُسے مار کر پھینک دیا۔ اس کا مرثیہ لکھا اور دلچسپ لکھا بعض لوگ کہتے ہیں کہ بلی کا نہیں بلکہ وزیر ابن فرات کا نوحہ ہے جو خلیفہ مقتدر کے حکم سے قید خانہ میں مارا گیا تھا۔ خوف کی وجہ سے اس نے بلی سے تعریض کی اور نام نہ لے سکا۔

(۱۲) ربیعہ بن ثابت۔ اندھا خوش گو شاعر۔ خلیفہ مہدی کا مداح تھا۔
ایک بار عباس کی مدح میں جو خلیفہ سفاح کا بھائی تھا۔ نہایت بلیغ قصیدہ سُنایا۔ اس نے صرف دو دینار انعام دیا۔ ربیعہ نے ناراض ہو کر ہجو کہی۔
عباس خلفاء عباسیہ کا بزرگ تھا اور دربار میں اس کی بڑی عزت تھی غضب ناک ہو کر ہارون الرشید کے پاس جو اس وقت خلیفہ تھا پہنچا اور ربیعہ کی شکایت کی۔ اس نے فوراً ربیعہ کو بلوایا اور چاہا کہ قتل کر دے ربیعہ نے کہا کہ پہلے قصیدہ تو سُن لیا جائے۔ کہا کہ سُناؤ۔ جب سُنا تو بہت پسند کیا۔ پھر پوچھا کہ اس کا تم کو کیا صلہ ملا۔ اس نے کہا کہ دو دینار۔ یہ سُن کر وہ عباس کی طرف مخاطب ہوا اور کہا کہ اس کا نہیں بلکہ آپ کا قصور تھا۔ پھر ربیعہ کو تیس ہزار درہم عطا کئے اور کہا کہ خبردار! کبھی اپنے اشعار میں ان کا ذکر نہ تصریحاً کرنا نہ تعریضاً۔

(۱۳) علامہ ابو البقاء عکبری بچپن میں چیچک نکلی تھی اسی میں آنکھیں جاتی رہیں۔ حافظہ نہایت قوی تھا تحصیلِ علوم کر کے مختلف فنون میں امامِ وقت ہو گئے۔ تفسیر۔ حدیث۔ فقہ۔ فرائض۔ حساب منطق۔ ادب۔ نحو اور لغت میں متعدد کتابیں املا کرائیں۔ جس فن میں کچھ لکھنا ہوتا تھا پہلے اس فن کی کتابیں پڑھوا کر سُنتے پھر لکھتے۔ بیشتر اُن کی بیوی ان کو پڑھ کر سُناتیں۔ دیوان حماسہ اور مقامات حریری کی شرحیں لکھوائی تھیں مگر حماسہ کی شرح میں تبریزی، اور مقامات کی شرح میں سرقسطی ان سے بڑھ گئے لیکن دیوانِ متنبی کی جو شرح کی تھی اس میں کوئی ان سے فوقیت نہ لے جا سکا چنانچہ وہی آج تک متداول اور مقبول ہے ۶۱۶ھ میں وفات پائی۔

(۱۴) عبدالرحمٰن سہیلی اندلسی متوفی ۵۸۱ھ سیرت ابن ہشام کی مشہور شرح۔ روض الانف کے مصنف۔ سیرت اور عربیت میں امامِ وقت تھے تفسیر۔ ادب اور تاریخ میں کئی تصنیفیں چھوڑی ہیں۔
روض الانف میں سوا سو کتابوں سے زیادہ سے مدد لی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ بڑی معلومات فراہم کی ہیں۔

۱۷ سال کی عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔

جب ان کے کمال کا شہرہ ہوا تو مراکش میں قضا کے عہدہ پہ بلوائے گئے۔ وہاں عزت کے ساتھ زندگی گذاری۔

(۱۵) عکوک شاعر متوفی سنہ ۲۱۳ھ۔ پیدائشی اندھا اور مبروص تھا۔ امیر ابو دلف کی شان میں ایک قصیدہ کہا جو اپنی خوبی کی وجہ سے بغداد میں بہت مقبول ہوا۔ مامون کا عہد تھا اس کا استبداد یہ گوارا نہ کر سکا کہ اس کے ایک خادم کی ایسی بلند رتبہ مدح کی جائے۔ عکوک کو گرفتار کرایا۔ اور اس الزام پہ کہ اس نے اپنے قصیدہ میں بعض ان صفتوں کو جو خالق کے ساتھ مخصوص ہیں مثلاً زمانہ پہ اختیار اور حکومت ایک مخلوق کی طرف منسوب کیا ہے حکم دیا کہ زبان گدی سے کھینچ لی جائے۔ اسی میں مر گیا۔

بعضوں نے کہا ہے کہ اگر یہی قصیدہ اس نے خود مامون کی ستائش میں لکھا ہوتا تو کوئی سزا نہ پاتا بلکہ صلہ ملتا۔

(۱۶) مؤمل کوفی متوفی سنہ ۱۹۰ھ۔ جوانی میں نابینا ہو گیا۔ طبیعت رسا رکھتا تھا۔ شعر گوئی شروع کی۔ ایک بار خلیفہ جعفر منصور کے ولی عہد مہدی کی مدح میں قصیدہ کہہ کر سنایا۔ اُس نے بیس ہزار درہم انعام عطا کیا۔ منصور نے جب سنا تو کہا کہ اس قدر فضول خرچی! فوراً پکڑ کر اس سے وہ رقم واپس لے لی، اور کہا کہ اس چھوٹے لڑکے کو تو نے جا کر دھوکا دیا۔ وہ تیرے دام فریب میں آ گیا۔

لیکن جب وہ قصیدہ سنا تو پسند کیا اور باوجود اپنی جوریسی کے حکم دیا کہ ربیع! اس کو چار ہزار درہم دے دو بقیہ بیت المال میں جمع کر دو۔

جب مہدی کا دورِ خلافت آیا تو مؤمل نے یہ سارا واقعہ لکھوا کر بھیجا وہ بہت ہنسا اور اس کو رقم واپس دلا دی۔

(۱۷) ابو العیناء مشہور ادیب اور مورخ۔ نہایت ظریف الطبع۔ خلیفہ متوکل کا ندیم تھا۔ اس کے بے شمار لطائف کتب محاضرات میں منقول ہیں۔

(۱۸) ابو العلاء معری۔ ذہن و ذکا اور حافظہ میں اعجوبۂ روزگار تھا۔ اور شعر و ادب اور عربیت میں یگانۂ دہر۔ شعراء میں متنبی کا بہت قائل تھا۔ اور اس کو بشار۔ ابو نواس بلکہ ابو تمام پر بھی ترجیح دیتا تھا۔ شریف مرتضیٰ اس کے برخلاف متنبی کو ناپسند کرتے تھے۔ یہ ان کی محفل میں جایا کرتا تھا۔ ایک دن اس کے سامنے انہوں نے متنبی کے کلام کے عیوب چن چن کر بیان کرنے شروع کئے۔ ابو العلاء نے کہا کہ اگر اس نے بجز اس قصیدہ کے جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے۔

لک یا منازل فی القلوب منازل

اور کچھ نہ کہا ہوتا تو یہی اس کی فضیلت کے لئے کافی ہوتا۔ شریف مرتضیٰ نے غضب ناک ہو کر اسی وقت اس کو مجلس سے نکلوا دیا۔ پھر لوگوں سے بولے کہ اندھے کا مطلب بھی تم سمجھے؟ متنبی کے اس قصیدہ

میں ایک شعر یہ ہے ؎

فاذا انتقك مذمتی من ناقص فهی الشهادة لی بانی عامل

جب کوئی ناقص آدمی میری مذمت کرے تو یہی میرے کامل ہونے کا ثبوت ہے۔

اُس کا اشارہ اسی کی طرف تھا۔

ابو العلاء نے آغاز جوانی میں حلب شام میں تحصیلِ علم کی۔ پھر لاذقیہ میں آیا۔ وہاں ایک راہب کی صحبت میں جو فلسفیانہ خیالات سے آشنا تھا۔ کچھ دن گذارے جس کے اثر سے عقائد اسلامیہ میں اس کو شکوک پڑ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام سے جا بجا الحاد ٹپکتا ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ ہیں جو اسے زندیق سمجھتے ہیں۔ اور کم ہیں جو اس کے الحاد میں شک کرتے ہیں اور یہ مسئلہ ایک مابہ النزاع مسئلہ ہو گیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ اس کے مذہب کے متعلق ایک فیصلہ کن بحث لکھ دوں لیکن مجھے اس کی دینی منزلت اس قابل نہ معلوم ہوئی اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے الحاد میں بحث کی گنجائش بھی کم ہے[1]۔

معری نے سنہ ۴۴۹ھ میں وفات پائی۔ تین سال کی عمر میں چیچک میں آنکھیں ضائع ہوئی تھیں۔ کہا کرتا تھا کہ مجھ کو سوائے سُرخ رنگ کے اور کوئی رنگ یاد نہیں ہے۔ کیونکہ بچپن کے زمانہ میں اسی رنگ کا کپڑا میرے بدن پر ڈالا جاتا تھا۔

**طلوع اسلام :-**

آخر میں ہم، مصر کے نامور ادیب، ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے نام کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ جن کی ذہانت، اور فطانت کی مثالیں کم ملتی ہیں۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری کی مشہور تصنیف

**الفتنۃ الکبریٰ** (اردو میں)

حضرت عثمانؓ کی شہادت اور اس کے پس منظر پر ——— محققانہ تبصرہ

ملنے کا پتہ :- مکتبہ طلوع اسلام - ۲۷/ بی - شاہ عالم مارکیٹ - لاہور

[1] ناصر خسرو علوی مشہور سیاح اس کے زمانہ میں معرۃ النعمان میں گیا تھا۔ اس کے بیان سے بھی جو اس نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ راہبانہ اور فلسفیانہ زندگی گذارتا تھا۔

# حقائق و عبر

**۱- ایک آدمی کے کھانے کا خرچ**

بادشاہ (یا کسی ریاست کا فرمانروا) ہمارے تمہارے جیسا انسان ہوتا ہے لیکن اس کا گذارہ دوسروں کی کمائی پر ہوتا ہے۔ وہ "دوسروں کی کمائی" کو خرچ کس طرح کرتا ہے، اس کا اندازہ، (مرحوم) ریاست حیدرآباد (دکن) کے مرحوم فرمانروا، میر محبوب علی خان، کے باورچی خانہ کے ان کوائف سے لگائیے جنھیں صدق جائسی صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اور عبدالماجد دریابادی صاحب نے اپنے اخبار میں درج فرمایا ہے ملاحظہ فرمایئے :-

اعلیٰ حضرت نواب میر محبوب علی خاں خلد آشیاں کے زمانے میں خاصہ کا کوئی وقت ہی مقرر نہ تھا چوبیس گھنٹہ خاصہ تیار رہتا تھا جس وقت اعلیٰ حضرت حکم دے دیں کہ خاصہ لاؤ۔ پھر خاصے پر سرکار جو چیز طلب فرمائیں وہ شے ایک منٹ کے اندر حاضر کی جاتی تھی۔ داروغۂ باورچی خانہ یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ سرکار اس وقت وہ چیز تیار نہیں۔ غلام رات کے خاصہ پر پیش کرے گا۔ پانچ سو باورچی تو صرف سالن پکانے پر مامور تھے۔ اور ہر باورچی کے لئے دو دو ہانڈیاں تھیں۔ شاہی قصر کے اس حصہ میں جس کا نام باورچی خانہ تھا، ہزارہا آدمی ۲۴ گھنٹے دوڑے دوڑے پھرتے تھے۔ یہ لوگ باورچیوں کے پیش دست اور مزدور ہوتے تھے حلوائیوں اور رکابداروں کا کارخانہ جدا تھا جو ہمہ وقت دنیا کی ہر مٹھائی تیار رکھتے تھے یہی صورت میووں اور تازہ پھلوں کی تھی۔ کہ ہندوستان کا ہر میوہ اور پھل ہمہ وقت تیار رہتا تھا۔

اور ان نظام دکن کی وفات کو دو چار سو برس نہیں کل پچاس ہی سال ہوئے ہیں یعنی سنہ ۱۹۱۱ء وہ اُن کے دور کے دیکھنے والے انسان ابھی سیکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔ واقعات اور حقائق بھی کتنی جلد افسانہ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ (بحوالہ آفاق ۷ اکتوبر سنہ ۱۹۶۰ء)

پانچ سو باورچی صرف سالن پکانے پر مامور تھے" باقر آن نے ملوکیت کی جڑیں یونہی نہیں کاٹی تھیں !!

**۲۔ مسلم ممالک**

ہمارے مسلم ممالک میں تو فواحش کی جس قدر گرم بازاری ہے۔ اس کے چرچے اکثر سُننے میں آتے رہتے ہیں، لیکن ان میں بعض اصناف ایسی ہیں جن کی مثال دُنیا کے کسی اور ملک میں شاید ہی مل سکے۔

ماہنامہ ترجمان القرآن میں، سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے "سفرِ ارضِ القرآن" کی روئداد شائع ہو رہی ہیں، اس میں ایک جگہ لکھا ہے :-

> بحرین میں ایک ایسی قبیح عادت کا ذکر سُننے میں آیا جسے زبان پر لاتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے، لیکن اس کا ذکر کیے بغیر یہاں کے اجتماعی حالات کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ غالباً اسلامی دنیا میں بحرین وہ واحد ریاست ہے جہاں بیسواؤں کی طرح لڑکوں کو بھی بدکاری کے لیے باقاعدہ حکومت کی طرف سے لائسنس دیا جاتا ہے۔ اس بُرائی کا علم اگرچہ چند سال پیشتر ایک فلسطینی دوست کے ذریعہ ہوا تھا۔ مگر یقین نہ آیا تھا۔ اب خود بحرین کے متعدد باشندوں کی زبان سے اس کی تصدیق ہو گئی۔ لاحول ولا قوۃ ...... (ترجمان القرآن بابت جون ۱۹۶۰ء ۔ صفحہ ۵۵)

**۳۔ سرزمینِ حجاز**

اسی سفرنامہ میں، ذرا سرزمینِ حجاز کے متعلق سُنئے ۔ وہی حجاز جس کے متعلق ببانگِ دہل کہا جاتا ہے کہ وہاں شریعت کے قوانین رائج ہیں اور جرائم کا نام و نشان نہیں۔ لکھا ہے :-

> سعودی عرب میں اس زمانہ میں بھی غلاموں اور لونڈیوں کا رواج ہے، شیخ عفیفی نے بتایا کہ یہاں جو غلام لونڈیاں آتی ہیں وہ یا تو مسقط اور عُمّان کی طرف سے آتی ہیں یا یمن کی طرف سے۔ ان کے جواز کی وجہ صرف یہ بیان کی جاتی ہے کہ لونڈی ـــــ یا غلام ـــــ اگر یہ کہتی ہے کہ "میں لونڈی ہوں اور میرے آباؤ اجداد قدیم زمانہ سے غلام چلے آتے ہیں"۔ اس کے صرف اس بیان پر اسے خرید لیا جاتا ہے اور اس کے لانے والے سے یہ معلوم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی کہ وہ ایسے کیسے لایا ہے، وہ اسے لالچ دے کر بھی لا سکتا ہے، ڈرا کر بھی لا سکتا ہے، اور اس کے ماں باپ سے خرید کر بھی لا سکتا ہے۔ ہاں اگر کوئی لونڈی ـــــ یا غلام ـــــ کہہ دے کہ مجھے زبردستی لونڈی ـــــ یا غلام ـــــ بنایا گیا ہے تو اسے آزاد کر دیا جاتا ہے"۔ مولانا نے فرمایا کہ "آخر وہ یہ بات کہہ کیسے سکتی ہے؟ آزاد ہو کر وہ تنہا جائے گی کہاں؟" اس پر شیخ عفیفی خاموش ہو گئے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ لونڈیوں کے جواز پر بعض لوگ فقہا کی کتابوں سے یہ مسئلہ بھی نکالتے ہیں کہ کافر کو فروخت کیا جا سکتا ہے، کافر خود بھی اپنے آپ کو فروخت کر سکتا ہے اور اپنے بیٹے یا بیٹی کو بھی فروخت کر سکتا ہے۔ لہٰذا اسے یا اس کے بیٹے یا بیٹی کو خریدا جا سکتا ہے، گویا حظّ لی عُشق (تفقیہ تخنہ مُجم سالیما را الا بلا بر سرِ مُلّا) والا معاملہ ہے۔ (ترجمان القرآن ۔ بابت اکتوبر ۱۹۶۰ء ۔ صفحہ ۲۱)

شیخ عفیفی صاحب کو غالباً اس کا علم نہیں ہو گا کہ "شریعتِ حقّہ" کی رُو سے، غلاموں اور لونڈیوں کے

جواز کے قائل خود مودودی صاحب بھی ہیں۔

## نیشنلزم کی لعنت

آج کل مصر اور شام وغیرہ عربی ممالک میں قومیت پرستی کی تحریک کا بڑا چرچا ہے "قومیت پرستی" سے مراد یہ ہے کہ قومیت کا مدار اشتراکِ دین پر نہیں بلکہ محض وطن نسل۔ یا زبان کے اشتراک پر رکھا جائے۔ اس تصور سے انسان کہاں جا پہنچتا ہے۔ اس کا اندازہ ایک عرب نیشنلسٹ کے ان خیالات سے لگائیے جو مذکورہ بالا سفرنامہ کے سلسلہ میں ترجمان القرآن کی ستمبر سنہ ۱۹۶۰ء کی اشاعت میں ان الفاظ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

> ناشتہ کے بعد دیر تک شیخ مَنّاع القطّان سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ وہ خاص طور پر عرب ممالک میں عرب قومیت کی تحریک سے سخت خطرے کا اظہار کرتے رہے۔ انہوں نے ایک مشہور عرب شاعر "القروی" کا قصیدہ ہمیں سنایا جس میں وہ کہتا ہے :-
>
> بلادک قدمها علی کل ملة — ومن اجلها افطر ومن اجلها صُم
>
> سلامٌ علی کفر یوحد بیننا — واهلاً وسهلاً بعده بجهنم
>
> فقد مزقت هذه المذاهب بیننا — وقد حطمتنا بین ناب ومنسم
>
> (اپنے وطن کو ہر دین و ملت پر مقدم رکھو۔ اسی کے لئے افطار کرو اور اسی کے روزہ رکھو۔ سلام ہو اس کفر پر جو ہمارے درمیان اتحاد پیدا کر دے۔ اس کے بعد اگر جہنم بھی نصیب ہو تو ہم اس کا خیر مقدم کریں گے۔ ان مذاہب نے تو ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور اونٹ کے دانتوں اور کھُروں کے درمیان ہمیں پیس ڈالا ہے۔)
>
> یہ اشعار سُنا کر انہوں نے کہا کہ عرب قومیت کی یہ تحریک ایک سیدھی سادی بے ضرر قسم کی قومی تحریک نہیں ہے۔ بلکہ درپردہ یہ مسلمانوں کو ان کے دین سے برگشتہ کرنے اور الحاد و دہریت کی طرف دھکیل دینے کی تحریک ہے جس کی سربراہی زیادہ تر یا تو عیسائی کر رہے ہیں یا مسلمانوں میں سے وہ فرنگیت زدہ لوگ جو دین کو اپنے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تصور کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس قصیدے پر مصر کی موجودہ حکومت نے "قروی" کو نیشان القداسہ (MEDAL OF HOLINESS) عطا فرمایا ہے اور عرب قوم پرستوں کے حلقے میں وہ "قدیس القومیۃ العربیہ" کے خطاب سے نوازا جاتا ہے یعنی عرب قومیت کا مہا پروہت (HIGH PRIEST)

اقبالؒ نے آج سے پچاس سال پہلے، اسی قومیت پرستی کے متعلق جو کہا تھا کہ

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے!

تو وہ کتنی بڑی حقیقت کی پردہ کشائی تھی۔

غور کیجئے کہ یہی وہ نیشنلزم تھی جسے تحریک پاکستان کے دوران ہمارے قومیت پرست علمائے کرام عین قرآن کے مطابق قرار دیتے تھے ، اور جسے دوبارہ زندہ کرنے کے لئے آج بھی پاکستان میں کئی قلوب مضطرب اور پریشان دکھائی دیتے ہیں ۔

## ۵۔ ہمارے محققین

دیوبند سے ایک رسالہ نکلتا ہے ـــــ "تذکرہ" ـــــ اس کی اکتوبر [illegible] کی اشاعت میں ایک مکتوب شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ـــــ نکاح حضرت یوسفؑ و زلیخا ـــــ

مکتوب نگار ہیں ، دارالعلوم ٹنڈو الہ یار کے صدر مدرس ، حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانوی ۔ مدظلہ ، اور مکتوب الیہ ہیں مولانا محمود حسن صاحب مدراسی ۔ اور مکتوب یہ ہے :-

عنایت نامہ نے خوش وقت کیا ۔ جواباً عرض ہے کہ مضمون نگار کو یہ تو تسلیم ہے کہ عام طور پر مفسرین نے سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام کا نکاح زلیخا سے ہونا ذکر کیا ہے ، گو قیل اور ذکر ہی کے عنوان سے کیا ہو پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں اس کی شہرت اتنی ہو گئی ہے کہ عموماً نکاح کے وقت زوجین کے لئے دعا میں بھی اللھم الف بینھما کما الفت بین سیدنا یوسف و زلیخا علیھما السلام کہا جاتا ہے ۔ اب اس واقعہ کو بے اصل قرار دینے کے لئے کسی وزنی دلیل کی ضرورت ہے ۔ بائیبل کا بیان اتنا وزنی نہیں کہ اس سے نکاح زلیخا کی نفی کر دی جائے کیونکہ ممکن ہے کہ دوسرا نکاح بعد زلیخا کے کسی دوسری عورت سے بھی ہوا ہو ۔

رہا یہ کہ بائیبل میں دونوں لڑکوں کے نام وہی ہیں جو روایات میں فرزندان زلیخا کے ہیں ، تو نام میں غلطی روایات صحیحہ میں بھی ہو جاتی ہے ۔ اس کو بائیبل والوں کی غلطی پر محمول کیا جائے گا یا اہل روایات کی غلطی پر محمول کیا جائے ۔ اب صرف مضمون نگار کے عقلی دلائل رہ گئے کہ جو عورت ھیت لک کہہ کر خود سپردگی کا مظاہرہ کر رہی ہو وہ ایک تاجدار صدیقیت و شہریار اقلیم عصمت کی معیت کے لئے کیونکر سزاوار ہو سکتی ہے ؟ بلکہ ایسی عورت ، قرآن کریم کے اصول الخبیثات للخبیثین الآیہ کی مصداق بن کر ، اس قابل نہیں کہ رسول کی بیوی بن سکے ۔

اس دلیل پر سب سے پہلے تو یہ اشکال ہے کہ قرآن کریم کا یہ اصول کیا مضمون نگار ہی کو سوجھا ؟ عام مفسرین کو نہ سوجھا ؟ انہوں نے کس طرح زلیخا سے نکاح یوسف علیہ السلام کو گوارا کیا اور اس کو تفاسیر میں داخل کر دیا ؟ ان مفسرین میں سب ہی حاطب لیل نہیں ۔ ان میں بیضاوی اور ابو السعود جیسے محققین بھی ہیں ۔ رہا اس کا یوسف علیہ السلام کو مجرم بنا کر اپنے شوہر کے جذبات کو برانگیختہ کرنا اور یوسف علیہ السلام کو جیل خانہ بھیجنا ، تو یہ حرکت برادران یوسف کے بیان کذب سے کچھ کم ہی ہے ، زیادہ نہیں پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ زلیخا سے جو کچھ بھی ہوا النفس تتمنی و تشتھی کے درجہ تک ہوا فالفرج

یصدقہ و یکذبہ کے درجہ تک نہیں پہنچا۔ اور مقدماتِ زنا صغائر میں شمار ہوتے ہیں جن کا صدور غیر نبی سے مستبعد نہیں۔ اور معتزلہ تو نبی سے بھی مستبعد نہیں سمجھتے۔

پھر یہ بھی معلوم ہے کہ یوسف علیہ السلام اس وقت غلام کی حیثیت میں تھے اور جس طرح شرعاً باندی سے آقا کو تمتع کا حق ہے ممکن ہے اس زمانہ میں سیدہ کو بھی اپنے غلام سے تمتع کا حق ہو۔

رہا یہ کہ وہ تو شوہر دار تھی، سو یہ بھی روایات سے معلوم ہے کہ شوہر عنین (نادر) تھا، اور عنین سے ہمارے یہاں بھی قاضی کو حق تفریق ہے۔ ممکن ہے اس زمانہ میں تفریق کے لئے قضاء قاضی شرط نہ ہو۔

پھر یہ سب اعمال زمانہ شرک و کفر کے ہیں۔ "الاسلام یھدم ما قبلہ" حدیث صحیح ہے پس ان واقعات کی بناء پر زلیخا کو بعد اسلام کے "المبشرات" میں داخل کرنا بلا دلیل بلکہ خلاف دلیل ہے خصوصاً جب کہ روایات میں یہ بھی ہے کہ زلیخا نے اسلام قبول کرنے کے وقت یوسف علیہ السلام سے چار شرطیں کی تھیں:

(۱) میری آنکھیں آپ کے غم میں روتے روتے اندھی ہو گئی ہیں، میری بینائی لوٹ آئے تاکہ میں آپ کا دیدار کر سکوں۔

(۲) آپ کے غم ہجر میں میری جوانی اور حسن جاتا رہا ہے میں از سرِ نو جوان اور حسین و جمیل ہو جاؤں۔

(۳) آپ مجھ سے نکاح کر لیں۔

(۴) میں جنت میں بھی آپ کے ساتھ رہوں۔

یوسف علیہ السلام نے تیسری شرط کے قبول میں تامل کیا تو وحی الٰہی سے قبولِ نکاح کا امر ہوا اور سب شرطیں منظور کی گئیں۔ تو جس خدا نے زلیخا کے ظاہری حسن و جمال اور بینائی کو دوبارہ لوٹایا اس نے اس کے دل کو بھی پاکیزہ بنا کر حسیات میں داخل کر دیا ہو تو کیا عجب ہے؟

روایات سے انقلاب ظاہری کا پتہ چل رہا ہے تو قبول نکاح کو انقلاب باطن پر کیوں محمول نہ کیا جائے۔ بہرحال مضمون نگار کے دلائل عقلیہ ایسے وزنی نہیں ہیں جن کی بنا پر روایات مذکورۂ تفاسیر کو یک لخت رد کر دیا جائے۔

امام رازی نے جو کچھ فرمایا ہے صحیح ہے کہ قرآن، اور حدیثِ مرفوع میں ان واقعات کا ذکر نہیں اور تفسیر قرآن اس پر موقوف بھی نہیں، اس لئے تفسیر کے طور پر ان کا ذکر مناسب نہیں۔ لیکن تاریخی حیثیت سے بھی ان کا ذکر جائز نہیں، اس پر کوئی دلیل قائم نہیں

قرآن کریم نے نہ عزیز مصر کی بیوی کا نام بتایا ہے، اور نہ ہی اس کے اسلام لانے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے نکاح میں آنے کا ذکر کیا ہے۔ لہٰذا یہ چیزیں قرآن کے دائرہ سے نکل کر تاریخ کے میدان سے متعلق ہو گئیں سوال یہ ہے کہ "بیضاوی اور ابو السعود جیسے محققین" کا ذریعۂ علم کیا تھا جس سے انہوں نے ان تمام جزئیات کی تحقیق فرمائی؟ ان کی تائید میں خود صاحب

مکتوب نے جو دلائل پیش کئے ہیں وہ آپ نے ملاحظہ فرمالئے ہیں یعنی

(۱) عام طور پر مفسرین نے سیدنا یوسفؑ کا نکاح زلیخا سے ہونا ذکر کیا ہے۔

(۲) پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں اس کی شہرت اتنی ہوگئی ہے کہ عموماً نکاح کے وقت زوجین کے لئے دعا مانگی جاتی ہے کہ (ان کے دلوں میں ایسی الفت پیدا ہو جائے جیسی الفت حضرت یوسفؑ اور زلیخا کے دلوں میں تھی)۔

یہ ہیں ہمارے ہاں "علم و تحقیق" کی بنیادیں، اور یہ ہیں وہ اہم مسائل جن کی تحقیق میں ہمارے علمائے کرام عمریں صرف کر دیتے اور بحثوں میں الجھے رہتے ہیں۔

## ہمارے علماء کا مبلغ علم

اکثر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے علمائے کرام عمر کا ایک حصہ مکتبوں اور دارالعلوموں میں تحصیل علم میں صرف کر دیتے ہیں، تو وہاں انہیں تعلیم کس قسم کی ملتی ہے؟ اس سلسلہ میں حافظ نذر محمد صاحب (سابق لیکچرار اسلامیہ کالج) کا ایک مضمون، نوائے وقت کی ۲۷ اکتوبر کی اشاعت خاص (انقلاب نمبر) میں شائع ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے لکھا ہے، مذہبی تعلیم کے سلسلہ میں پہلے ابتدائی مکاتب سامنے آتے ہیں جن میں قرآن کریم ناظرہ پڑھایا جاتا ہے اور کہیں کہیں تجوید اور قرأت کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔ مغربی پاکستان میں ایسے مکاتب بیس پچیس ہزار سے زائد موجود ہیں۔

ان کے بعد وسطانی مدارس ہیں جن میں درس نظامی کی ابتدائی کتابیں اور گلستان، بوستاں تک فارسی زبان کی تدریس ہوتی ہے۔ اس قسم کے مدارس مغربی پاکستان میں چھ سو سے زائد ہیں۔

ان کے بعد دارالعلوم اور جامعات آتے ہیں جن میں درس نظامی کی مکمل تعلیم دی جاتی ہے۔ اس درجہ کے دارالعلوم مغربی پاکستان میں ایک سو کے قریب ہیں۔ ان دارالعلوم میں کیا پڑھایا جاتا ہے، اس کی تفصیل خود حافظ صاحب کے الفاظ میں سنئے۔ وہ فرماتے ہیں۔

درس نظامی کے مضامین۔ مدارس عربیہ کا موجودہ نصاب آٹھ سالہ ہے گویا ایک اوسط درجہ کے طالب علم کو عموماً آٹھ نو سال میں درجہ تکمیل و فضیلت کی سند ملتی ہے۔ یہ نصاب مندرجہ ذیل سترہ مضامین کی ۸۵ (پچاسی) کتب پر مشتمل ہے جس کے کل صفحات اٹھارہ ہزار پانچ سو چھتیس ہیں:-

| نمبر شمار | مضامین | کتب | صفحات | نمبر شمار | مضامین | کتب | صفحات |
|---|---|---|---|---|---|---|---|
| ۱ | صرف | ۶ | ۳۷۸ | ۵ | منطق | ۱۲ | ۱۳۱۳ |
| ۲ | نحو | ۶ | ۶۳۶ | ۶ | فلسفہ | ۳ | ۵۶۳ |
| ۳ | معانی و بیان | ۳ | ۵۵۲ | ۷ | علم کلام | ۴ | ۴۲۸ |
| ۴ | عروض | ۱ | ۶۴ | ۸ | ادب عربی | ۷ | ۱۵۲۵ |

| نمبر شمار | مضامین | کتب | صفحات |
|---|---|---|---|
| ۹ | سیرۃ و تاریخ | ۲ | ۵۰۰ |
| ۱۰ | طب | ۴ | ۷۸۶ |
| ۱۱ | ہیئت | ۲ | ۱۸۸ |
| ۱۲ | ہندسہ | ۱ | ۲۰۰ تقریباً |
| ۱۳ | مناظرہ | ۱ | ۲۵۰ تقریباً |
| ۱۴ | فقہ، اصول فقہ | ۱۳ | ۲۶۴۶ |
| ۱۵ | تفسیر، اصول تفسیر | ۴ | ۱۶۳۶ |
| ۱۶ | حدیث، اصول حدیث | ۱۱ | ۴۴۳۰ |
| ۱۷ | تجوید و قرات | ۵ | ۲۵۰ تقریباً |
| | کل میزان | ۸۵ | ۱۸,۵۵۴ |

ان سترہ علوم کی ۸۵ کتابوں کی فہرست پر نگاہ ڈالئے۔ اس میں آپ کو قرآن کریم کا نام کہیں دکھائی نہیں دے گا۔ اس ضمن میں حافظ صاحب لکھتے ہیں :-

> یہاں ایک اور بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے اگر یہ تمام مضامین قرآن فہمی کے لئے پڑھائے جاتے ہیں تو پھر قرآن حکیم کب پڑھایا جاتا ہے۔ کیا یہ ایک حقیقت نہیں کہ چند مدارس کو چھوڑ کر کہیں بھی قرآن مجید کی مکمل تفسیر و تشریح کا انتظام نہیں۔ کتاب اللہ کے بغیر دینی تعلیم کی تکمیل کیونکر ہو جاتی ہے۔ بالیقین کہا جا سکتا ہے کہ دورِ حاضر کے فتنوں کی بڑی وجہ یہ ہے کہ منبع علم و عرفان کتاب اللہ سے غفلت برتی جا رہی ہے خواہ وہ یونیورسٹی اور کالج میں ہو یا مسجد و مدرسہ میں۔

یہی بات اگر طلوع اسلام کہہ دے تو کافر قرار پا جائے!

اس کے بعد حافظ لکھتے ہیں :-

> دینی مدارس کے طلبا کا دنیا سے یکسر بے خبر ہونا حد درجہ افسوس ناک ہے وہ اکثر مسائل حاضرہ کو نہ سمجھتے ہیں نہ ان کے حل پیش کر سکتے ہیں۔ انہیں تحریکاتِ جدیدہ کی کوئی واقفیت نہیں۔ جدید تقاضوں نئے طرزِ فکر اور ضروریات کا انہیں کوئی علم نہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ان کے نصاب اور مشمولہ کتابوں کی قدامت ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل چند مثالوں سے ہو سکتا ہے :-

| مضمون | قدیم ترین کتاب سنہ تصنیف | جدید ترین کتاب سنہ تصنیف |
|---|---|---|
| صرف | سنہ ۱۲۱۳ء | سنہ ۱۸۶۰ء |
| منطق | سنہ ۱۲۶۱ء | سنہ ۱۸۲۸ء |
| طب | سنہ ۱۰۳۵ء | سنہ ۱۶۲۷ء |
| فقہ | سنہ ۱۰۳۶ء | سنہ ۱۶۵۵ء |
| نحو | سنہ ۱۳۲۳ء | سنہ ۱۷۷۶ء |
| فلسفہ | سنہ ۱۴۳۷ء | سنہ ۱۲۵۱ء |
| ہندسہ | سنہ ۱۲۷۳ء | سنہ ۱۴۷۳ء |
| تفسیر | سنہ ۱۳۱۶ء | سنہ ۱۵۰۵ء |

گویا خالص دینیات کی کتب ہوں یا دین سے متعلقہ (بالفاظ دیگر دنیاوی) علوم کی کتب ہوں۔ دونوں ہی قدیم مصنفین و مؤلفین کی کاوش فکر کا نتیجہ ہیں اس کا لابدی نتیجہ یہ ہے کہ وہ جدید معلومات سے خالی، مسائل حاضرہ اور اُن کے حل سے عاری ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہے کہ قدیم کتب کے مندرجات جدید انکشافات اور معلومات کے منافی اور ضد ہیں۔

یہ ہے اس "علم" کی کیفیت جس کے حصول کے بعد یہ حضرات، سندِ فضیلت حاصل کر لیتے اور مستند عالم قرار پاتے ہیں۔ اور اس کے بعد ان کا دعوےٰ اور مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ دُنیا کا کوئی معاملہ ہو، اس کے جائز و ناجائز ہونے کا فتویٰ ہم سے لو۔ اور جو کچھ ہم کہیں اسے خدا و رسول کا فرمان سمجھو۔

## عملِ تکفیر

"صدق جدید" (لکھنؤ) کی ۱۵ جنوری ۱۹۶۰ء کی اشاعت میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے۔

صنعت تکفیر کے چند شاہکار

(از مظہر اعلیٰ حضرت "مولوی حشمت علی صاحب پیلی بھیتی")

اس میں عملے کے تحت لکھا ہے۔

اسی پیر نیچر (سر سید احمد خاں) کے اذناب و متبعین و مقلدین و مرتدین نیاچرہ جو مسلمانوں کے دین و ایمان اور ان کے دنیوی سرو سامان پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے ہمیشہ نئی نئی کمپنیاں، نئی نئی پارٹیاں گھڑتے رہتے ہیں، اور کبھی بندگانِ زر اور بدنام کنندہ نکو نامے چند نام کے مولویوں کو اپنے کفری مقاصد کی ترویج و اشاعت کے لئے اپنا آلۂ کار بنا لیتے ہیں۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔ ندوۃ العلماء۔ خدام کعبہ۔ خلافت کمیٹی۔ جمعیت العلمائے ہند۔ خدام الحرمین۔ اتحاد ملت۔ مجلس احرار۔ مسلم لیگ۔ اتحاد کانفرنس۔ مسلم آزاد کانفرنس۔ نوجوان کانفرنس۔ غازی فوج۔ جمعیت تبلیغ اسلام انبالہ۔ سیرت کمیٹی پٹی ضلع لاہور۔ امارت شرعیہ، بہار شریف۔ آل پارٹیز کانفرنس وغیرہ کمیٹیاں اسی مقصد کے لئے انھیں کفرہ نیاچرہ نے اپنی نیچریت اور دہریت پھیلانے اور بھولے بھالے مسلمانوں کو دین سے آزاد اور دنیوی سرو سامان سے بھی تہی دست بنانے کے لئے وقتاً فوقتاً خود اپنے ہاتھوں سے، یا دوسرے بد دینوں، بد مذہبوں کو اپنا شریک کار بنا کر، یا بعض جاہلوں، سادہ لوح بے وقوفوں یا چند دین فروش دنیا خر طاؤں کو دام فریب میں پھانس کر انھیں اپنا آلۂ کار بنا کر گھڑی ہیں۔

(باقی ص 80 پر دیکھئے)

# ایک اہم سوال

## اطاعتِ رسول

قارئینِ طلوعِ اسلام میں سے ایک علم دوست بزرگ نے ایک ایسا سوال پوچھا ہے جو اربابِ تحقیق کو دعوتِ فکر و تدبر دیتا ہے۔ ہم اسی مقصد کے پیشِ نظر اسے درج ذیل کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے :-

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اسلام میں اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت، دو مستقل بالذات، الگ الگ اطاعتیں ہیں۔ اللہ کی اطاعت قرآن کریم کی رو سے کی جاتی ہے، اور رسول کی اطاعت، احادیث کی رُو سے۔

اطاعتِ رسول کے سلسلہ میں عام طور پر دو گروہ سامنے آتے ہیں۔ ایک کا عقیدہ یہ ہے کہ حضورؐ نے منصبِ نبوت پر فائز ہونے کے بعد، اپنی حیاتِ ارضی کے آخری سانس تک، جو کچھ فرمایا وہ سب خدا کی طرف سے وحی تھا۔ دوسرے گروہ کا عقیدہ ہے کہ حضورؐ نے جو کچھ بحیثیت رسول فرمایا وہ وحی پر مبنی تھا، جو کچھ بشری حیثیت سے فرمایا، وہ وحی نہیں تھا۔ حضورؐ کی اطاعت اول الذکر حیثیت سے ہے۔

ظاہر ہے کہ ان دونوں گروہوں میں یہ چیز قدرِ مشترک ہے کہ جن امور میں حضورؐ کی اطاعت اُمت پر ہمیشہ کے لئے لازم ہے، وہ امور خدا کی طرف سے بذریعہ وحی نازل ہوئے تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وحی کا ایک حصہ جسے وحی متلو کہا جاتا ہے، قرآن کریم کے اندر ہے اور دوسرا حصہ (جسے وحی غیر متلو کہا جاتا ہے) قرآن کریم کے باہر احادیث میں ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر قرآن اور حدیث دونوں منجانب اللہ وحی ہیں، تو ان کی اطاعت، اللہ کی اطاعت ہوگی رسول کی اطاعت نہیں ہوگی۔ مثلاً، اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیا۔ (یہ حکم قرآن میں درج ہو گیا)۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اقامتِ صلوٰۃ کا طریقہ بتایا (یہ وحی حدیث میں آ گئی)۔ جب دونوں حکم خدا کی طرف سے تھے تو دونوں کی اطاعت، اللہ کی اطاعت ہوئی۔ اس صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی بات باقی رہ جاتی

ہے جسے رسول کی اطاعت کہا جائے؟ یہ بات تو سمجھ میں نہیں آئی کہ منجانب اللہ وحی کے ایک حصہ کی اطاعت، خدا کی اطاعت کہلائے اور اسی خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی وحی کے دوسرے حصے کی اطاعت، رسول کی اطاعت کہلائے۔ وحی متلو ہو یا غیر متلو۔ جلی ہو یا خفی۔ قرآن میں ہو یا حدیث میں۔ وہ بہرحال خدا کی طرف سے تھی، اس لئے اس کی اطاعت خدا کے احکام کی اطاعت ہوگی۔ رسول کی اطاعت نہیں ہوگی۔ اگر کہا جائے کہ ان احکام کی اطاعت، رسول کی اطاعت اس لئے کہلائے گی کہ اُمت انہیں رسول اللہ کی زبان سے سُنتی تھی۔ اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ پھر خدا کی اطاعت کسے کہا جائے گا؟ کیونکہ اُمت، قرآن کریم کو بھی رسول اللہ ہی کی زبان مبارک سے سُنتی تھی۔

میں شکرگذار ہوں گا اگر آپ میری اس اُلجھن کو دُور فرما دیں گے!

طلوع اسلام: یہ ہے ان کا سوال — وحی کے متعلق ہمارا مسلک قارئین کو معلوم ہے۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جس قدر وحی حضور پر نازل ہوئی تھی وہ سب کی سب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اس لئے ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ محترم مستفسر کی اس اُلجھن کو دُور کر سکیں۔ اگر کوئی صاحب، جو قرآن کریم سے باہر وحی منجانب اللہ کے قائل ہوں، اس باب میں کچھ تحریر فرمائیں تو طلوع اسلام اسے بخوشی شائع کرے گا۔ بشرطیکہ وہ علم و تحقیق پر مبنی ہو۔ محض جذباتی نہ ہو۔ اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ نقطۂ زیر بحث یہ نہیں کہ وحی کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں یا نہیں۔ سوال دریافت طلب یہ ہے کہ اگر قرآن اور حدیث دونوں وحی منجانب اللہ ہیں، تو ان میں سے ایک کی اطاعت، اللہ کی اطاعت اور دوسری کی اطاعت، رسول کی اطاعت کس طرح کہلائے گی؟

## بقیہ حقائق و عبر

اور مسلک کے تحت۔

وہابیہ، دیوبندیہ۔ قادیانیہ۔ روافض۔ نیچریہ۔ خاکساریہ۔ چکڑالویہ۔ احراریہ۔ وحید الدھاریہ، آغا خانیہ۔ وہابیہ۔ بہائیہ۔ وہابیہ غیر مقلدین۔ وہابیہ نجدیہ۔ لیگیہ۔ غالیہ، دعلی کلیہ، غالبیہ۔ اپنے عقائد کفریہ قطعیہ، یقینیہ کی بنا پر بحکم شریعت قطعاً یقیناً اسلام سے خارج اور کفار و مرتدین، جو مدعی اسلام ان میں سے کسی کے قطعی یقینی اطلاع رکھتے ہوئے بھی ان کو مسلمان کہے یا اس کے کافر و مرتد ہونے میں شک رکھے یا اس کو کافر و مرتد کہنے میں توقف کرے۔ وہ بھی یقیناً کافر و مرتد ہے اور بے توبہ مرا تو مستحق نار ابدی ہوگا۔ اس کے لئے دیکھئے (۱) تحفہ مذہب اہل السنۃ صفحہ ۹۔

(۱) تحفہ مذہب اہل السنۃ صفحہ ۹ (۲) تحفہ مذہب اہل السنۃ صفحہ ۲۴۔

(طلوع اسلام) زادہ اللہ